

لطیفیات (جلد دوم)

یعنی

ایم۔ حسن لطیفی۔ بی اے (جرنلسٹ)

کا

مجموعۂ کلام اُردو

جسکو

مصنف مذکور کی اجازت سے

محمود علی عارف بی۔ اے

نے

شاطو پریس ویکفیلڈ گنج لودیانہ میں چھپواکر فروری ۱۹۲۵ء میں لدھیانہ سے شائع کیا

۲

عنوانیہ



ہندوستان

کی

مشترکہ زبان

کے

نام

(لطیفی)

Dedication لے

اُردو سے....

اے کہ تجھ میں عجم و ہند کا شامل ہے لہُو!
اے کہ شیراز و اَوَدھ سے ہے تجھے ربطِ نموُ!
میں تری کشتِ ادب میں وہ گہر بوتا ہوں
جن سے شرمائیں سمندر کی تہوں کے لُولُو
جذبِ انشارِ رگِ دل سے ہے نیساں بکنار
گریۂ خامۂ رشحات کا ایک ایک آنسو
یُوں تو شعریتِ عجمی ہے تری نغز و نظیف
اور موسیقیٔ بھاشا خنک الحانِ گلوُ!
گلۂ جزرِ نموُ ہے نئے انشا کو مگر
کہ ابھی نکہت و رنگِ سبدِ گُل ہے فرو

سبزہ حاصل نہیں خمیازۂ سیرِ گلچیں!
کہ خیاباں میں ابھی کم ہے شگفتِ خودرو!

خوشۂ تاک زباں ہائے دگر کے خم سے
دُرد آشام تراجم ہیں ترے جام و سبُو
زخمِ تخریب دیا تھا جو مکالے نے تجھے
چاک اُس کا نہ ہوا آج تک اپنوں سے رفو

ابھی محدود وطن تک ہے ترے نام کی دھوم
ایشیا میں ابھی پھیلی نہیں تیری خوشبو
کسی جنگل کے گُل و سنبلِ خودرو کی طرح
ابھی بے غازہ و بے شانہ ہیں گال اور گیسو
دامن آسودہ ہیں یوں نابغۂ نامحرم
جیسے گہوارۂ صحرائی میں نایاب آہو!

Macaulay (1835) ے

موشگافی ہے تغزّل میں تو تسلیم تری

کہ محاکات میں کامل ہے ہر انگارۂ مو

پر ادھورے ہیں تیا ترمیں ترے نقش و نگار

کہ ہر آرائش نو اُس کے جلو میں ہے "دبو"[۲]

دُور تر ہے تُو ابھی محملِ سنمائی سے

اور درکار ہے اس وادیٔ فن میں تگ دو

نشرِ اصوات[۳] و صوَر[۴] تک ہے رسائی دشوار

اے محبک زینۂ لاسلکیٔ تارِ لب و رُو!

تیری پرواز سے کہتی ہے طرازِ سہ[۵] جہت!

"تُو ابھی نیم رس اور خام ہے مجھ کو مت چھُو"

---

۲ Debut (نمائش اوّلیں)

۳ Radiophony (یہاں ریڈیو ڈراما مراد ہے)

۴ Wireless Television.

۵ Tridimensinal Talkies.

نادمیدہ ہیں ابھی تیرے ہزاروں شعبے
ناتراشیدہ ہیں تیرے ابھی لاکھوں پہلو
یہ دعا ہے تو یونہی ہند میں پروان چڑھے
لہلہائے کہیں جیسے کوئی گلشن لبِ جو
برگِ ارزاں سے فراواں ہوں ترے پختہ ثمر
رشکِ صد فصلِ بہاراں ہو تری فصلِ درو[۶]
پتیاں غنچۂ صد آبلۂ دل کی تجھے
پیش کرتا ہوں میں اے پیکِ صبائے اردو!
کیا سے کیا، آہ! یہ صد پارہ فسانہ ہو جائے
لے اڑے اس کو رمِ نافہ کی مانند جو تو
لطیفی

---

۶ مصدر "درودن" کا حاصل مصدر بہ معنی کھیتی کاٹنا

اشاعتِ اوّل

یادش بخیر، سلسلۂ لطیفیات کی ابتدا جولائی ۱۹۲۸ء میں
ہوئی تھی، جبکہ جناب لطیفی ہنوز کالج میں تھے، ساڑھے چھ سال گذرنے
کے بعد موصوف کے دوسرے مجموعۂ شعر کی پہلی ایڈیشن ناظرین کی
خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس جلد کے بیشتر پارہ ہائے لطیف
ہندوستان کے مختلف جرائد و رسائل کی زینت اوراق ہو چکے
ہیں، مصنف کے مشورے سے شیرازہ کو یکجا کرتے ہوئے ایک دو
منسوخ منظومات کے علاوہ چند ایک دیگر پارے بھی حذف
کر دیئے گئے ہیں، جہانتک تدوین کی حیثیتِ مجموعی کا تعلق
ہے (کتاب کے آخری حصّے میں متعدد تازہ یا غیر مطبوعہ
نظموں کے اضافے کی بنا پر) جلد کے نصفِ آخر کی ترتیب
نصفِ اوّل کے پیرائے پر نہیں رہ سکی، انشاء اللہ اگلے ایڈیشن
میں اس خامی کا ازالہ کر دیا جائیگا، اگرچہ "لطیفیات" کسی

طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے لوازم کے جزئیات پر ایک طائرانہ نگاہ ناگزیر ہے، لیکن لطیفی صاحب کی رائے ہے کہ ادبی کتب کی پہلی اڈیشن دیباچے سے خالی ہونی چاہیئے، تاکہ قارئین ناشروں، پطرسوں اور سر عبدالقادروں کی مستعار آراء سے بے نیاز ہو کر براہ راست ادبی لذت سے محظوظ ہو سکیں! اس لئے اس جلد کے اس اڈیشن میں کوئی پطرس نامہ شامل نہیں کیا گیا، البتہ دوسرے اڈیشن میں جناب طرزی (علیگ) کے قلم سے ایک جامع دیباچہ شریک اشاعت ہوگا انشاءاللہ

آخر میں تعویقِ طباعت کیلئے معذرت خواہ ہوں اور اس امید کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ منظوم مجموعہ بہت جلد شرف مقبولیت حاصل کریگا،

شاطو، ویکفیلڈ گنج
یکم فروری ۱۹۳۵ء

عارف (بی-اے)



M. Hasan Latifee

لطیفی کا خیر مقدم

(سیاحت یورپ کے بعد مراجعت وطن کے موقع پر)

از

حضرت اختر شیرانی مدیر "خیالستان" لاہور

منتظر تھا ترا محبوب وطن، تیرے لئے!
یہ وطن، یہ ترا شاداب چمن تیرے لئے!
چشمِ مینا سے لہو روتا تھا میخانۂ ہند
کتنا غمگین تھا یہ "دیر کہن" تیرے لئے!
بمبئی تک تیرے مشتاق چلے آئے ہیں
تیرے دیرینہ رفیقانِ وطن تیرے لئے!
خیر مقدم کے لئے شوق سے ہے چشم براہ
گلشنِ ہند کا ہر سرو و سمن تیرے لئے!

کلفتِ راہ مٹانے کو ہے ساغر در دست
منتظر میکدۂ گنگ و جمن تیرے لئے!

فرش کے بدلے بچھاتی ہے نسیمِ سحری
نکہتِ نسترن و بوئے سمن تیرے لئے!

آسماں بیخود ہے خوشی سے کہ بجز گردشِ جام
گردشیں بھول گیا، چرخِ کہن تیرے لئے!

ہو مبارک تیرا آنا، ارے آنے والے!
یوں دعاگو ہیں عزیزانِ وطن تیرے لئے!

آسماں جاہ لطیفی تیرا مستقبل ہو!
یوں ثناخواں ہیں جوانانِ چمن تیرے لئے

دلِ اختر سے نکلتی ہے یہ مستانہ دعا
تو وطن کے لئے ہو اور وطن تیرے لئے!

مطبوعہ۔ روزنامہ "ویر بھارت" لاہور مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۳۱ء
مطبوعہ۔ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۳۲ء

ترتیب نما

لطیفیات (جلد دوم)

صفحہ	عنوان	نمبر
۲	عنوانیہ	۱
۳	"اردو سے .. .. "	۲
۵	اشاعتِ اوّل	۳

۴	لطیفی کا خیر مقدم (از اختر شیرانی)	۹
۵	ترتیبِ نما	۱۱
۶	"ہمہ از من"	۳۳
۷	"سازِ خودی کی صدائے شکست!"	۳۴
۸	"سلام کہہ دینا!"	۳۸
۹	غزل	۴۰
۱۰	"جدائی"	۴۱

۱۱	"پریشانیٔ خواب"	۴۳
۱۲	"چہ بینم!"	۴۵
۱۳	"مجھے بھول جاؤ!"	۴۶
۱۴	"آجا!"	۴۸
۱۵	"جذبات"	۴۹
۱۶	"رشحات"	۵۱
۱۷	غزل	۵۳

۱۸	غزل	۵۵
۱۹	"صنفِ نازک!"	۵۹
۲۰	"پھولوں میں پھول!"	۶۴
۲۱	"سرکس کی لڑکی!"	۶۶
۲۲	"ندی کے کنارے!"	۷۳
۲۳	"خمارِ دوشین!"	۷۷
۲۴	"استعارۂ مستعار"	۷۹

۲۵	"ایک نسائی پیکر سے ۔ ۔ ۔"	۸۲
۲۶	"حسرت"	۸۵
۲۷	"رقص"	۸۶
۲۸	"پردہ نشین سے ۔ ۔ ۔"	۸۹
۲۹	"ت ۔۔ ۔ ۔ کی تصویر"	۹۳
۳۰	"کیوپڈ اور اس کا ہمصفیر"	۹۵
۳۱	مشاہدہ	۱۰۰

۳۲	"مژدۂ تبسم"	۱۰۴
۳۳	"ڈک پر ایک شام"	۱۰۵
۳۴	"چاندنی رات کی ناتمام جھلک"	۱۰۷
۳۵	"سمندر کی طوفانی شام"	۱۱۱
۳۶	"مہتابِ زمستان"	۱۱۴
۳۷	"ہنی مون کی ایک رات"	۱۱۹
۳۸	"بادہ افشانی"	۱۲۱

۳۹	"کیفِ وداعِ خزاں"	۱۲۳
۴۰	"میرے خوابوں کی بستی"	۱۲۸
۴۱	"سروِ خود رَو"	۱۳۱
۴۲	"مجبوری	۱۳۷
۴۳	"اُلوالعزمی"	۱۴۰
۴۴	"اعتبار"	۱۴۲
۴۵	"خیال" (ایک مجسّمہ فرض کرکے)	۱۴۵

۴۶	"نکتہ ہائے ممکنات!"	۱۴۸
۴۷	"بنفشی شعاعیں!"	۱۵۰
۴۸	"آرٹ"	۱۵۲
۴۹	"سرزمین رستم و اسفندیار سے خطاب"	۱۵۵
۵۰	"یغمان" (خیابانِ افغانستان)	۱۶۰
۵۱	"اے سرزمین پنجاب!"	۱۶۵
۵۲	"عزمِ انگلستان"	۱۶۹

۵۳	"اندلس کا چاند"	۱۷۳
۵۴	"وادیِ نیل سے . . . . . ."	۱۸۴
۵۵	"جیحوں کا منظرِ جنگ"	۱۸۷
۵۶	"جذبۂ ایثار"	۱۹۱
۵۷	"دعوتِ عمل (حبیب وفا سے)"	۱۹۳
۵۸	"تا چند؟"	۱۹۶
۵۹	"ہندو جاتی"	۱۹۸

۶۰	"بسراوقات"	۱۹۹
۶۱	"بھکاری بچے!"	۲۰۳
۶۲	"ایک غریب الوطن کی التجا!"	۲۰۸
۶۳	"ہم کیا تھے!"	۲۱۰
۶۴	"الطزناطیف"	۲۱۲
۶۵	"سپہ سالار سنز نگا چیم"	۲۱۴
۶۶	اسلام کی آخری متاع پر پروفیسر بروس کا ناپاک حملہ	۲۱۷

۶۷	"حجازی قافلے کا زخمی سپاہی"	۲۱۹
۶۸	"معرکۂ حق و باطل"	۲۲۱
۶۹	"صبح نور افشاں"	۲۲۳
۷۰	"بھیگی ہوئی رات"	۲۲۵
۷۱	"خون کے آنسو"	۲۲۷
۷۲	"انتباہ!"	۲۳۲
۷۳	سہرا (سعید)	۲۳۳
۷۴	"فریاد بدرگاہِ ربِّ قہار!"	۲۳۵

۷۵	سہرا (عارف)	۲۳۹
۷۶	قطعہ	۲۴۱
۷۷	نالۂ شمع	۲۴۲
۷۸	"قیدی"	۲۴۳
۷۹	"فتنۂ مرزائیہ"	۲۴۴
۸۰	"کل کے ترشے ہوئے بُت!"	۲۴۷
۸۱	"جگن ناتھ تھاپر"	۲۴۹

۸۲	"نہلے تے دھلا"	۲۵۲
۸۳	"کانگرس کی ارتھی"	۲۵۵
۸۴	"نقشِ لوح"	۲۵۸
۸۵	"انجام کسی کا"	۲۵۹
۸۶	"دعائے شام	۲۶۱
۸۷	"ایک بوالہوس کی بیزاری"	۲۶۳
۸۸	"حسرتِ واپسیں"	۲۶۵

۸۹	"شیلے کی یادگار"	۲۶۷
۹۰	"کیفیتِ یاد" (سانیٹ)	۲۶۹
۹۱	"پنکھڑیاں"	۲۷۱
۹۲	"رُباعی"	۲۷۲
۹۳	"پنکھڑیاں"	۲۷۳
۹۴	"سرمایہ"	۲۷۷
۹۵	"کیا کہوں!"	۲۷۸
	"غلام"	۲۷۹

۹۶	"الہام عشق!" (کامریڈ جواہر لال نہرو کو پیامِ اسلام)	۲۸۱
۹۷	"پیشکش" (بہ بطلِ مشرق امان اللہ)	۲۸۹
۹۸	"فلسطین"	۲۹۴
۹۹	"نیاز و نیائش"	۲۹۷
۱۰۰	"نیرنگیٔ اعتقاد"	۳۰۱
۱۰۱	"اب کس کو پوچھتے ہو؟"	۳۰۵
۱۰۲	"نیلا ناگنی"	۳۰۹

۱۰۳	"سلیقہ"	۳۱۳
۱۰۴	"صدا بہ صحرا"	۳۱۶
۱۰۵	"شعلہ نوائی!"	۳۲۲
۱۰۶	"عشرتِ امروزہ"	۳۲۶
۱۰۷	"پہلی لغزش"	۳۲۹
۱۰۸	"کہاں سے کہاں!"	۳۳۶
۱۰۹	"پودے کا روگ"	۳۵۳

۱۱۰	"رنگ زر کا راز" (سورۃ الحدید)	۳۵۸
۱۱۱	"پنکھڑیاں"	۳۶۰
۱۱۲	"والنگا کی مرغابی"	۳۶۱
۱۱۳	"صلیب اور تاج"	۳۶۵
۱۱۴	"نبدگال کا باغی شاعر"	۳۷۰
۱۱۵	"فروغِ مشتِ خاک"	۳۷۵
۱۱۶	"چندے کی وبا"	۳۷۷

۱۱۷	"ساقی"	۳۸۲
۱۱۸	"لطیفی سے ......" (از اختر موہانی)	۳۸۵
۱۱۹	"نوائے تہنیت" (از ایم جعفری)	۳۸۷
۱۲۰	"سہرا" (از عارف، نذیر وغیرہم)	۳۹۰
۱۲۱	"غائبانہ یاد" (از اختر شیرانی)	۳۹۲
۱۲۲	"جوانی"	۳۹۳
۱۲۳	"نابغہ"	۳۹۸

۱۲۴	"تبریک"	۴۰۵
۱۲۵	"مرجھانے کے بعد"	۴۰۷
۱۲۶	"مشربِ ہوس"	۴۰۹
۱۲۷	"معراج"	۴۱۱
۱۲۸	"ایک وہ ہیں!"	۴۱۵
۱۲۹	انگریزی ترتیب نما"	۴۲۴

لطیفیات

(جلد دوم)

ذاق



ہمہ از من

دریں معمورۂ بے اعتباری اعتبار از من
کہ پیمانِ محبت پائدار و استوار از من،
گدازِ شعلہ و آتش گدائے اخگرِ جانم
فروغِ التہاب از من تب و تابِ شرار از من
نشاطِ جشنِ مے دریوزۂ عیشِ فراوانم
گل از من محفل از من دورِ مے از من خمار از من
سوادِ وادیٔ رنگین تبسم چیں ز دامانم
شگفتِ غنچہ از من انبساطِ برگ و بار از من
چمن صد پیرہن اندوز از چاکِ گریبانم
گل از من خندہ از من رنگ و بو از من بہار از من!

(ارضِ لُدؔ، ۲۱ مئی ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۳ جون ۱۹۳۲ء)

سازِ خودی کی صدائے شکست

(قلم بر داشتہ)

جو رومانِ رنگین کی روح رواں تھی
اسی جانِ روماں کی اب داستاں ہوں
کبھی ایک گردوں تھا میرا سراپا
اب اس کا میں اک کوکب رائیگاں ہوں
ذرا ریگزاروں کی وسعت سے پوچھو
کہ کس گمشدہ کارواں کا نشاں ہوں؟
بکھر کر فضاؤں میں جو پھیل جائے
وہ آوارہ نالہ ہوں بے خانماں ہوں
جو برسا کراوروں پر اپنی جوانی
تہی کیف ہو جائے وہ نوجواں ہوں
شبِ عشرت افروز روشن تھی جس سے

اُسی شمعِ محفل کا اُٹھتا دھُواں ہوں

کسی بے رُخی سے تعرض نہیں اب

یہ حالت ہے اپنے سے خود سرگراں ہوں!

نظر سے مری سب حجاب اُٹھ گئے ہیں

میں دُور از نگارہ بہار و خزاں ہوں

نہ منزل ہے منزل نہ رہزن ہے رہزن

میں برتر از احساسِ سُود و زیاں ہوں

بہت دُور ہوں دورِ شام و سحر سے

نہ پوچھو کہ کس حال میں ہوں؟ کہاں ہوں؟

ہیں بے چین جس کی طلب میں فرشتے

میں فطرت کے دل کا وہ رازِ نہاں ہوں

سمجھنا مرا کارے دارد لطیفیؔ

معمّا ہوں، اسرار ہوں، چیستاں ہوں

ارض لُد۔ یکم جون ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لُدھیانہ (۱۰ / جون ۱۹۳۲ء)

جذباتی



سلام کہدینا

ذیل کی نظم (جو غزل بھی کہلا سکتی ہے) ارض تاج سے آگرہ کے معزز معاصر "تاج" (ہفتہ وار) نے ۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں ہدیۂ قارئین کی،

۵ ستمبر کی شب کو ماسٹر ارشاد نے جو منظومات "نشاط" کے صحن میں ہارمونیم اور طبلہ کے ساتھ گا کر سنائی تھیں۔ ان میں سے یہ "چیز" بھی بہت پسند کی گئی تھی،

لطیفی

سُنا چکے جو خبر مرگِ بے نوا کی صبا!
تو دردِ دل کی دوا کو سلام کہدینا

غریب ہی تو تھا، دنیا سے اُٹھ گیا جو کوئی
تو خیر، اُن کی بلا کو سلام کہدینا

گداز سے آداب عرض کر دینا
سخی کی شانِ سخا کو سلام کہہ دینا

سزا بھی جرم اُمیدِ کرم کی مل نہ سکی
ستم ظریفِ جفا کو سلام کہہ دینا

تیرے گریز سے ظالم! وہ مر مٹا آخر
یہ کہہ کے جانِ حیا کو سلام کہہ دینا

سلام مانے نہ مانے وہ روٹھنے والی
مگر نگاہِ خفا کو سلام کہہ دینا

فریب خوردۂ پیماں کا حال بتلا کر
زمانہ سازِ وفا کو سلام کہہ دینا

ملے جو راہ میں اے آہِ نارسا وہ کہیں
مری طرف سے دُعا کو سلام کہہ دینا!

ارض گد ۲۷ر اگست سنہ ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدہ "تاج" آگرہ (۸ر ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۵ر ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء)

ناتمام غزل

مضرابِ آرزو سے ذرا دل کو اور چھیڑ
کیوں مطرب اس رباب کو خاموش کر دیا

رگ ہائے ماہتاب نے ٹپکا کے خونِ ناب
آسودہ موجِ بادہ کو سرجوش کر دیا

آیا جو نیم ہوش میں مخمورِ چشمِ مست
پھر جرعۂ نگاہ سے مدہوش کر دیا

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!

مطبوعہ "علیگڈھ میگزین" علیگڈھ (جنوری ۱۹۲۹ء)
مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

جُدائی

ذیل کی نظم نومبر سنہ ۱۹۳۱ء میں یورپ سے واپس آتے ہوئے ایس ایس وائسرائے آف انڈیا (جہاز) پر لکھی گئی اور پہلی مرتبہ "خیالستان" (مارچ سنہ ۱۹۳۲ء) میں چھپی، جس موضوعِ محبّت کی مفارقت اِس نظم کی محرّک ہوئی اُس کے محبوب نام کو، اس احتمال سے کہ کہیں نشترِ لذّت سے وہ اپنی شیرینی کھو نہ لے فی الحال ایک "راز" ہی رہنے دیتا ہوں!

لطیفی

جُدائی ایسی تھی کچھ بے پناہ، رُک نہ سکی
کسی سے مل کے بھی ملنے کی آرزو ہی رہی
اک آستاں سے مرا شوق ناتمام پھرا
جو نارسا تھی تمنّا وہ تشنہ خو ہی رہی

کسی کو آہ میں جی بھر کے پیار کر نہ سکا

مرے شباب کو تسکیں کی جستجو ہی رہی

نظر پہ [illegible] کسی کی جلوہ گری

تڑپ کے رہ گئیں مجبوریٔ نظر کی حدیں

جو پھر جہاز پہ خشکی کا کچھ خیال آیا

سمٹ کے پھر گئیں آنکھوں میں بحر و بر کی حدیں

اک ارض چھو گئی قدموں کو [illegible] آکر

اگرچہ دور تھیں اُن سے کہیں سفر کی حدیں

وفا میں دست و گریباں ہوس کی گردش میں

الٰہی یُوں بھی ہے آوارہ باوفا کوئی؟

بکھر بکھر کے جو یُوں دُور دُور ایک رہے

خدائی بھر میں ہے ایسا بھی اے خدا کوئی؟

مرا وجود کہیں، دل کہیں، خیال کہیں،

مری طرح نہ ہو غربت سے آشنا کوئی!

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (مارچ ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۵-اپریل ۱۹۳۲ء)

پریشانیٔ خواب

لطیفی صاحب کی یہ نظم نہ صرف حسنِ انکار کے لحاظ سے لطیف ہے بلکہ اسے پڑھکر شبہ ہوتا ہے کہ اُس "مجاز" میں کچھ حقیقت بھی پنہاں ہے، اگر ایسا ہے تو

"کہدے کوئی جاکے مصحفی سے
ہوتی ہے بُری یہ چاہ ظالم"

(اختر شیرانی)

تیرے خیال کی مستی سے میری رات تھی مست
وہ نشہ میری فضائے سکوں میں تھا پیوست
اسیر جس میں تھی یکسوئیٔ خیال پرست
طلسمِ خوابگہِ دل تھا ناشناسِ شکست
کچھ ایسی بے خود و مدہوش تھی مری دُنیا
کہ کائنات فراموش تھی مری دُنیا
خمارِ میکدہ بردوش تھی مری دُنیا

جہانِ کیف درِ آغوش تھی مری دنیا
ابھی تھا ہوش اپنے نہ اختیار مجھے
خبر نہ تھی کہ کہاں لے گیا خمار مجھے
ابھی نصیب تھا وہ کیفِ خوشگوار مجھے
نہ کر سکا تھا پریشان انتشار مجھے

جو چین تیرے تصوّر کی گود میں پائے
ترے خیال کے جھولے میں جسکو نیند آئے
وہ تابِ برہمیِ خواب کس طرح لائے؟
ترا خیال جب اُس بے نوا سے چھن جائے

کس آستاں پہ گِروں جا کے میں اگر جاؤں؟
پناہ دے نہ تری یاد تو کدھر جاؤں؟
میں بدنصیب نہ کیوں جان سے گزر جاؤں
تباہ ہو کے غمِ بے کسی سے مر جاؤں!

لاہور۔ جنوری ۱۹۳۰ء

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (اپریل ۱۹۳۰ء)

چہ بینم!

پسِ شکستِ بتانِ مجاز، یادِ نگار
پری تراش و صنم ساز و بُت گرے بینم!

ہزار لعبتِ رعنا و دلفریب دوچار
چہ خوب شکلِ صنم زارِ دیگرے بینم!

یک اشتیاقِ نگاہم صد آرزو بکنار
ہجوم بُتکدہ نگرم کہ پیکرے بینم!

زیک شباب صد آشوبِ دیدنی بیدار
بہ پردۂ نگہ نیرنگِ محشرے بینم!

بیا بیا بہ ادائے خلیلِ خوش رفتار
درونِ خلوتِ آغوشم آذرے بینم!

ارض لد- ۱۱ر جون ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۷ر جون ۱۹۳۲ء)

مجھے بھول جاؤ!

چلو یوں سہی میرا دل دل نہیں تھا
وفا کا لہو اس میں شامل نہیں تھا
یہ سچی محبت کا حامل نہیں تھا
تمہاری پرستش کے قابل نہیں تھا
یہ بہتر ہے اب تم مجھے بھول جاؤ

غضب کی تھی اُف وہ ملاقات پہلی
جب اک کم زباں سے تھی کی بات پہلی
وہ ہلکی سی بوندیں وہ برسات پہلی
خُدا جانے کیسی تھی وہ رات پہلی
یہ بہتر ہے اب تم مجھے بھول جاؤ

دلوں کو نہ مدہوشیوں میں ڈبوتے
وہ جامِ محبت سے پیئے ہی نہ ہوتے

خود اپنے کئے پر نہ اس طرح روتے
نہ ماضی کے ماتم میں یوں وقت کھوتے
یہ بہتر ہے اب تم مجھے بھول جاؤ

نہ دل چین پائے تمہاری بلا سے
جو فرقت ستائے تمہاری بلا سے
گھٹا اب جو چھائے تمہاری بلا سے
بلا مجھ پر آئے تمہاری بلا سے
یہ بہتر ہے اب تم مجھے بھول جاؤ

محبت کے "جھوٹے" خطوں کو جلا دو
مری یاد تم لوحِ دل سے مٹا دو
اب آنسو یہ کیسے؟ بھلا دو، بھلا دو،
جو رونا ہے، مجھ کو انہی میں بہا دو
یہ بہتر ہے اب تم مجھے بھول جاؤ

(جون ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۴ جون ۱۹۳۲ء)

آجا!

رنجیدہ و برہم نہ ہو اتنی سی خطا پر
مٹنے سے مرے خوش ہے تو لے مجھکو مٹا جا

مجبوریٔ انکار سے میں خوار ہوا ہوں
اب رحم کر اور اس کو مرے دل سے بھلا جا

کٹتی ہے جوانی مری بے لذت و بے لطف
پھر نرگسِ میگوں سے وہی کیف لٹا جا

پی کر ترے ہاتھوں سے کبھی ہوش نہ آئے
اے ہوش ربا ساقیہ کچھ ایسی پلا جا

دھندلائی سی دنیا کو میں پہچان رہا ہوں
وارفتۂ فرزانہ کو دیوانہ بنا جا

دنیا سے مجھے واسطہ؟ دنیا سے غرض کیا؟
میرے لئے سب کچھ ہے تو اے جانِ من آجا

نینی تال ۔۔ ۷ رجولائی ۳۲ء

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۵ راگست ۱۹۳۲ء)

جذبات

(۱)

ایک حسین خیال کا اُف یہ نفوذ زود اثر
ذہن سے مَس ہوا اِدھر دِل میں اُدھر وہ بس گیا

ابرِ کرم کا منتظر گریہ نصیب ہی رہا
کس کو خبر وہ بارہا چپکے سے یوں برس گیا

کاش بھری ہوئی نگہ بھولے سے پھر اِدھر پھرے
اتنی سی "بھول" کے لئے میں تو ترس ترس گیا

نالہ اسیرِ دل جو تھا، رنگ جنوں کا لے اُڑا
یعنی قفس کو توڑ کر غمزدہٗ قفس گیا

(ب)

نیم پنہاں سی جھلک، خوابِ گریزاں کی نمود،
اُن کی محجوب نگاہوں میں حیا ہوتی ہے!
تازہ موسم سے نیا رُوپ بدلتی ہے ہوس
ایک ہی رنگ سے شاداب و نما ہوتی ہے!
خواب گاہوں میں فرشتے بھی تڑپ جاتے ہیں
شب کو جنبش میں جو معصوم دعا ہوتی ہے!
چُومتا ہوں لبِ خنجر کو، بلائیں لیکر
رسمِ بیداد پذیری کی ادا ہوتی ہے!

(جولائی ۱۹۳۲ء اور اپریل ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۵ اگست ۱۹۳۲ء)

رشحات

کوئی شاخِ تشنہ و خشک جس سے ہری نہ ہو وہ سحاب کیا؟
جو جھلک کے رنگ نہ بھر سکے رگ و ریشہ میں وہ شباب کیا؟
دلِ گمشدہ کو میں ڈھونڈنے کہیں شب کو محوِ جنوں چلا
تو صدا سی آئی یہ سینہ سے کہ تلاشِ خانہ خراب کیا؟
طرب آفریں سہی رُت کبھی ملے بار سوز کو ساز ہیں
نہ تنوّع آشنا بھی جس کی طرزِ نوا میں ہو وہ رباب کیا؟

نہیں پھول پھول مہک بغیر کھلے بلا سے کھلا کرے
ہو مشام تازہ نہ جس کی روحِ شمیم سے وہ گلاب کیا؟
تمکنیں یہ شرم نہاں کی ہیں نظر آ رہا ہے جو پردہ سا
ہو نہوں میں گر نہ حیا کے جلوہ دبی ہوئی تو حجاب کیا؟
جو لکھے تھے شوق سے خط انھیں فقط آشنا اُن کا جواب تھا
کہ جواب ایسی جسارتوں کا سکوت ہو تو جواب کیا؟
جو پلائی ہے تو یہ مستیِ مئے عیش، رات کا ساتھ دے
ہو دراز نشّہ نہ جس کا شمع کے بُجھنے تک وہ شراب کیا؟
(۱۱رضی لد۔ یکم اگست ۳۲ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۵ا ستمبر ۱۹۳۲ء)

ناتمام غزل

(ہارمونیم پر گانے کے لئے)

میں کیا بتاؤں مرے دل پہ کیا گذرتی ہے
تو سوز و سازِ محبّت سے آشنا ہی نہیں
جو خوش نصیب محبّت کی موت مرتے ہیں
ثباتِ زارِ وفا میں انھیں فنا ہی نہیں
یہ پھانس رہنے دو میری شکستہ رگ میں ابھی

خلش نہ ہو تو جراحت میں کچھ مزا ہی نہیں
تلاشِ چارہ ہے لئے چارہ ساز لاحاصل
یہ درد وہ ہے کہ جس کی کوئی دوا ہی نہیں
بجز تمہاری تمنّا و آرزو کے سوا
طلب ہو اور کسی کی میں وہ گدا ہی نہیں
میں سر جھکائے ہوئے کب سے انتظار میں ہوں
نگاہ ریز ادھر خنجر آزما ہی نہیں
دِلوں کو سوز سے تڑپائے جس کی لے مطرب
ترے رباب کی تاروں میں وہ نوا ہی نہیں

(نوشتہ ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ ستمبر ۳۲ء)

ناتمام غزل

(ہار نیم پر گانے کے لیے)

کیا قیامت ہے مرے دل کے مسیحا بنکر
درد کو اور بھی ناچار کئے جاتے ہیں

میں یہ سمجھا تھا جدائی میں ہے جینا مشکل
میرا مرنا بھی وہ دشوار کئے جاتے ہیں

ہائے میں کس سے کہوں کیا ہے خفا ہو جانا
زندگی سے مجھے بیزار کئے جاتے ہیں

چاہنے والوں سے انجان سبنے بیٹھے ہیں

اپنی تصویر سے جو پیار کئے جاتے ہیں
خود بخود پہلوئے عاشق میں چلے آئینگے

وہ جو انکار پہ انکار کئے جاتے ہیں
خوشگواری ہے اسی یاد سے تنہائی میں

جس کو وہ مونس و غمخوار کئے جاتے ہیں
غم کا درماں نہ سہی حسرت و حرماں ہی سہی

کچھ تو تسکین دلِ زار کئے جاتے ہیں
کشتۂ ناز کی تربت پہ لگا کر ٹھوکر

بختِ خوابیدہ کو بیدار کئے جاتے ہیں
دیکھئے کیا ہو سے آشامیِ دل کا انجام

مستیٔ عشق سے سرشار کئے جاتے ہیں

(۱۹۳۰ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (؟)

محاکاتیہ



صنفِ نازک!

صنفِ نازک کی کائناتِ حسیں
ہیئتِ حسن میں جمیل تریں
اس کی ہستی کے خطّ و خالِ لطیف
ذوقِ ندرت کا ایک خوابِ لطیف
گاہے اس پر سراب کا دھوکا
گاہے عکسِ شباب کا دھوکا
اس کی فطرت میں وہ تبسّم ہے
جس کے افسوں میں اک جہاں گم ہے
رنگ اُسی سے ہے نو بہاروں میں!
نور اُسی سے ہے سب ستاروں میں

حُسن اُس کے بغیر زِشت و سیاہ

لُطف اُس کے بغیر حسرت آہ

اُس کی شانِ ملاطفت مخصوص

اور اچھوتا مذاقِ حسنِ خلوص

اُس کی رعنائی میں حیائے کشش

اُس کی مستی میں عِفّت لغزش

فتح اُس کی ہزیمتوں پہ نثار

فخر اُس کی ندامتوں کا شکار

لگتا ہے بے رحم جانستان ہے وہ

لگتا ہے سو میوں کی جان ہے وہ

چھیڑ کر جائے گر جھلک اُس کی

پھر نہ دِل سے مٹے کسک اُس کی

اُس کا ہر اک اشارۂ ابرو

طُرفہ کارو کرشمہ و جادُو

الاماں اُس کے عشوہ ہائے نگاہ
اُن کی غارت گری معاذاللہ!
سحر کاری میں منتہائے کمال!
خوش طرازی میں شاہکارِ جمال
گامزن ہے وہ محوِ سیرِ حیات
رہ میں بکھرے ہوئے ہیں امکانات
تودہ ہائے گلابِ بوقلموں
لکہ ہائے سحابِ گوناگوں
کیفِ موسم کے دیدہ زیب آثار
رنگ و نکہت کے دلفریب انبار
چھا رہے ہیں خلائے امکاں پر
سطح ہائے فضائے نسواں پر
اُف یہ واکردہ باب کی دُنیا
دل بہ کف انتخاب کی دُنیا

تازہ واردکی دیکھئے تو نظر
تیز تر ہے قدم سے جس کا سفر
پائے پس ماندہ سے نگاہ آگے
اور نگہ سے خیالِ راہ آگے
یہ خیال و نگاہ و جسم کا طور
باہمی فاصلوں سے جاذبِ غور
خارجی وسعتوں میں پھول بھی ہیں
ساتھ پھولوں کے کچھ ببول بھی ہیں
اور وہ حلقہ ہائے سیر و خرام
یعنی ماحول کے دوائرِ عام
جنس و سن کا جہاں لحاظ نہیں
ایسی بے خود ہے فطرتِ رنگیں
یادِ آلام و راحتِ ماضی
جس کے نزدیک خبطِ بے معنی

انتظارِ نشاطِ مستقبل

جس کے دستورِ عیش میں مہمل

بے نیازِ متاعِ دوش و مآل

جس کی ہر زندگی ہے حال ہی حال

کچھ سمجھائی وہاں نہیں دیتا

معصیت سے نظارہ ہے دھندلا

پاسِ عصمت نہ خوفِ رسوائی

غیر ممکن ہے قیاس آرائی

ہاں مگر ہے اسی کی تہ میں نہاں

تار و پودِ فسانۂ انساں

(۱۱؍اپریل ۱۹۳۳ء)

(۱۴؍اپریل ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ رسالہ "شاہجہاں" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۲۹؍مئی ۱۹۳۴ء)

پھولوں میں پھول

مینائی بدن کی طرز نمود ایک اچھوتی لائی ہوئی
رس اور لطافت سے سینچی، ناطورۂ خوش[1] گدرائی ہوئی
پھولوں میں پلی، کلیوں میں تُلی اس طرح لدی ہے ہاروں سے
اک تودۂ نازک کے نیچے جیسے کہ حسیں شاخ آئی ہوئی
گوری سی کلائی کو گھیرے کچھ نرم گلابی پنکھڑیاں
شانوں پہ بکھیرے کاکل کو اور کاکل بھی مہکائی ہوئی
ننھی سی ذرا سی کلیوں میں سرتاج کلی چٹکی ہے جہاں
رنگین و حسیں ہمجنسوں سے شاداں ہے نہیں بہلائی ہوئی
بے ہوش سی ہیں امواج ہوا خود نکہت بھی وارفتہ سی
باریک قمیص اس پیکر کی کچھ ایسی ہے مسکائی ہوئی

---

[1] ناطورہ مونث ہے۔ ناطور کی، عربی میں اس کا وہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں مالن کا، یعنی باغ کی نگہبانی کرنیوالی

یہ کھیل کنواری لڑکی کا معصوم بھی ہے اور مہلک بھی

افسوں سا چلائے دیتی ہے دزدیدہ نظر مہکائی ہوئی

البیلی ایسی پھواروں سے پھولوں پہ چھڑکنا ننھی صہبا

کیا جانے کہاں وہ بھول گئی میناسی کوئی چھلکائی ہوئی

اس کی ننھی رفتار میں ہاں جنبش تو ذرا سی ہونے دو

کترے گی ابھی کچھ اور بھی گل پھر چال وہی اٹھلائی ہوئی

"فرگٹ می ناٹ"[1] جو لپٹے ہیں آخر وہ بھلا دو ایسی انہیں

اور یاد رہیگی اس گل کی اس دل پہ ہمیشہ چھائی ہوئی!

۲۰ جون ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (یکم جولائی ۱۹۳۲ء)

---

[1] Forget-me-not (مجھے نہ بھولو) — ایک قسم کا انگریزی پھول،

سرکس کی لڑکی

۱۵ اگست کی شب کو "روشنی" کے میلے میں

"رائل ڈیکن سرکس" کا ایک تماشا دیکھکر

م۔م۔ی۔د...... نے اس نظم کی نسبت یوں اظہار

خیال فرمایا ہے :۔

"A Consummate Piece of Descriptive Art."

چُست اور چالاک
بے خوف و بیباک
بانکی، طرحدّار
تیز اور طرّار

جوبن اُبھارے
گیسُو سنوارے
لڑکی ہے وہ یا
پچکیلی گُڑیا
کرتب دکھائے
فتنے جگائے
جس نے بھی دیکھا
کہتا ہی ہوگا
"تُو ہے جسم تیرا
بے حد چھریرا
برجستہ تیری
ہر اک پھریری"
"ایکٹنگ" کے تیور
بہتر سے بہتر

غمزے خوش اسلوب
عشوے بہت خوب
"پارٹ" اتنا دلکش
جس پر ہو "عش عش"
اوپر ہیں تلوے
اور اُن کے نیچے
لے دے کے اک ٹیک
یعنی طشت ایک
جس پر وہ رقصاں
گردان وجنباں
بازو ہلائے
چھتری گھمائے
"گیسوں" کا یہ حال
جگمگ ہے پنڈال

چھتری کا دامن
کرنوں سے روشن
رنگوں کے حلقے
ایسے نرالے
قوس قزح کے
شرمائیں ہالے
مشتاق لڑکی
مردوں میں کھیلی
چتون دکھا کر
نظریں لڑا کر
ہر دل کو کھینچے
ہر دل کو لوٹے
گاہے لچک کر
گاہے اُچک کر

گاہے سنبھل کر
گاہے مچل کر
گاہے سمٹ کر
گاہے اُچٹ کر
اُف یہ تماشا
کافر ادا کا
نٹنی بھی ایسی
ہوگی نہ کوئی!
گاہے وہ لیٹے
چھتری لپیٹے
کچھ دیر جم کر
کچھ دیر تھم کر
پھر اُٹھ کے بیٹھے
چھتری کو کھولے

پونچھے رُخِ تر
رومال لیکر
کچھ تولے تالے
چھتری سنبھالے
نزدیک آئے
پھر لوٹ جائے
خط کے برابر
اک جست بھر کر
اُف تیز گامی
چابک خرامی
چھتری ہے کوڑا
اور تار گھوڑا
رانوں میں لرزش
باہوں میں جنبش

لوچ اُن میں ایسا
لہروں میں جیسا
پھرتی سے مُڑ کر
دیکھے اِدھر پھر

اُس کی ادائیں
دِل کو لُبھائیں

اور "گیلری" سے
آواز آئے

"ہائے جوانی!
او مار ڈالا"

پھر تالیوں سے
پنڈال گونجے

(ارض لُد —— ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لُدھیانہ (۱۹ اگست ۱۹۳۲ء)

ندّی کے کنارے

پَو پھٹنے میں ہے کچھ دیر
مہ کا ہے نزدیک زوال
نُور کا تڑکا اور دیہات
پگڈنڈی سی کچھ پامال
اک رہرو جوگن پرچھائے
شاخوں کی چھاؤں کا جال
پی کی نگری کو وہ جائے
بہکی بہکی اُس کی چال

سر کے اوپر ہیں شمشاد
چمپا سوسن اور کچنال[۱]
ٹنکیں کیڑے لس پر یوں پھول
جیسے خوشبودار گلال
کندھے اس کے نرم سڈول
لمبے لمبے کالے بال
نینوں میں کاجل کی دھار
اور گلابی نازک گال
گردن میں ہیکل کا ہار
ہلکا سا باریک ہلال
اُف یہ جوبن اور یہ رُوپ
یہ سِن یہ رُت اور یہ سال

---

[۱] ہندی میں کچنار کو کچنال بھی کہتے ہیں۔

یُوں رستے میں کوئی جوان

گر دیکھے تو ٹپکے رال

. . . .

. . . .

آخر ساحل کے نزدیک

آتی ہے وادی کی ڈھال

چل کر کچھ خشکی کے بعد

رستہ ملتا ہے سیّال

کہتی ہے وہؐ اے ملّاح!

جلدی کر یہ وقت نہ ٹال

جانا ہے اِس ندّی پار

اُٹھ اپنے پتوار سنبھال

اب کھینے میں ہے کیا دیر

کشتی کو لہروں میں ڈال

بالم کی بستی ہے دُور

دُوری سے ہوں میں بیحال

. . . .

. . . .

جانا ہے اس ندّی پار

اٹھ اپنے پتوار سنبھال

. . . .

". . . . ."

(ناتمام)

(اکتوبر ۳۲ء)

مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی۔ (نومبر ۱۹۳۲ء)

خمار دوشیں

مآلِ شب سے طلوعِ سحر کا ہے آغاز
ستارہ صبح کا رقصاں ہے والہانہ ہنوز
اسیرِ خواب شبستاں میں تھی کوئی شہناز
گلوں کی سیج میں تھا جذبِ ساحرانہ ہنوز
طلسمِ خواب میں آسودہ چشمِ فسوں ساز
ہوئی تھی صبح کی آہٹ سے نیم وانہ ہنوز
خموشیوں کے حجابوں میں تشنۂ آواز
چھپا ہوا تھا کہیں صبح کا ترانہ ہنوز
ذراسی جنبشِ مژگاں سے تھی وہ نرگس باز
تلاش کرتی ہے جو نیند کا بہانہ ہنوز

اس انگھڑی میں جو ہے کیفِ خواب کی غمّاز
جھلک رہی ہے وہی مستیٔ شبانہ ہنوز
جبینِ ناز پہ بکھری ہوئی ہے زُلفِ دراز
اِس انتشار کو ہے انتظارِ شانہ ہنوز
برنگِ زُلفِ پریشاں خرام کا انداز
خمارِ خواب سے ہے لااُبالیانہ ہنوز

(اپریل سنہ ۱۹۲۹ء)

مطبوعہ رسالہ "ہمایوں" لاہور (جون سنہ ۱۹۲۹ء)



استعارۂ مستعار

۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کے "زمیندار" میں مولانا ظفر علی خاں صاحب اساتذۂ عجم میں سے کسی کے اِس شعر کا ذکر کرتے ہوئے ؎

چشم چوں پُر عشوہ کرد آں دل بسوئے خویش دید
پارۂ خود خورد ساقی ساغرِ لب ریز را

رقمطراز ہیں کہ وہ اِس نشاط آور شعر کو پڑھکر وجد میں آ گئے

بیشک شعر لاجواب ہے، عجمی شاعر نے اپنے تصرفِ عقلی سے ایک تشبیہہ مجازی پیدا کر کے الوان مو قلم کے بغیر مصوّری کا معجزہ دکھایا ہے۔ ذیل میں یہی استعارہ (Metaphor) مستعار لیکر دیگر اشعار کے ہمراہ پیش کیا گیا ہے،

لطیفی

وہ کچھ کتراے کچھ شرمائے، کچھ آنکھیں چرائے ہیں
جھجک سے، بھول پن سے، لوچ سے پہلو بچائے ہیں
اُنہی کو دیکھے جاتی ہے نگاہِ شرمگیں اُن کی
حیا آلودہ ہیں اِس طرح مژگانِ حسیں اُن کی
جبیں بھیگی ہوئی ہے شرم کی بوندوں کے عنواں سے
گرے جاتے ہیں کچھ موتی ڈھلک کر اُنکی افشاں سے
جوانی کہہ رہی ہے یوں لجائیں وہ جواں ہو کر
حجاب اب عنقریب ان کا رہے گا شوخیاں ہو کر
وہ اپنی ہی نظر سے دیکھتے ہیں قامتِ موزوں

اُنہی پر چھا جاتا ہے خود ان کا بے پناہ افسوں

یہ نورسِ عنفوان ان کا یہ ان کی شانِ خود بینی

نگہ پاشی سے کچھ پہلے یہ اندازِ نگہ چینی

یہ طرزِ ابتدا ملتی ہے اس ساقی کے پینے سے

جو پہلا گھونٹ خود پی لے چھلکتے آبگینے سے

(۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)



ایک نسائی پیکر سے

رسالۂ "جہانگیر" لاہور (اگست ۱۹۳۶ء) میں ذیل کی عاشقانہ نظم (جو اوائل جون میں مدیرِ "جہانگیر" براہ راست مجھ سے لیگئے تھے) ہدیۂ قارئین کی گئی ہے "حسنِ اتفاق کہیے یا مدیرِ جہانگیر" کا حسنِ شرارت کہ ہندوستان کی ایک بایۂ ناز ایکٹرس مس (؟) "سلطانہ کا رنگین فوٹو میرے "مخاطبانہ" اشعار کے بالمقابل اس طرح شائع ہوا کہ میری "ناکردہ گناہی" اپنی "سادہ بیکسی" پر آہ بھر کے رہ گئی" اب میں بھی اپنی برأت کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا ——— !

کردن تو ——— عذرِ گناہ بدتر از گناہ ——— اگر کہیں

بھولے سے موصوفہ کی نظر تصویر کے بعد میری نظم پر پڑ گئی اور انہیں

ذرا سا بھی "شک" ہوگیا ——— تو ——— میں "خونِ دو عالم" اپنی گردن پر

لینے کے سوا کیا کرسکونگا ————— لطیفی

تری شگفتِ دل آرا کی کیف زا لہریں
ہوں رش کے پردہ میں نیشِ عدو خدا نہ کرے

تبسموں سے نگاہوں سے خوش اداؤں سے
ہلاکت آورد قاتل ہو تو خدا نہ کرے

جو کفر پاش ہو اُس ارتعاشِ مستی سے
مری نظر کے مقابل ہو تو خدا نہ کرے

شکیبِ سوزیٔ ہیجانِ نشّہ گوں بکنار
ہوں برقِ ہوش ترے رنگ و بُو خدا نہ کرے

شدید و تُند تاثر سے حشر در داماں
اُبل پڑے ترا جوشِ نمو خدا نہ کرے

"میں دیکھ لوں تجھے عُریاں" مگر پھر اسکا مآل؟
بر آئے بھولے سے یہ آرزو خدا نہ کرے

حریف جلوہ تو ہوں تاب لا نہیں سکتا

ہو شاد کام یہہ نظّارہ مجھ خدا نہ کرے

مری ہی شوخ نگاہی ہو جب کبھی ہو کسوا

ترے حجاب کو بے آبرو خدا نہ کرے

تری رضا ہو مرے داعیات کی ہمرنگ

یہ رنگ لائے کبھی تیری خو خدا نہ کرے

ترے ستم کا ابھی زیر بار احساں ہوں

مزید لطف پہ مائل ہو تو خدا نہ کرے

(۱۶ مئی ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ رسالہ "جہانگیر" لاہور (اگست ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۲ اگست ۱۹۳۲ء)



حسرت

سمندر موجزن، چپو شکستہ، ناخدا لرزاں
دعائیں ساحلِ تاثیر کو حسرت سے تکتی ہیں!

رقص

ذیل کی نظم اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء کے بحری سفر کے دوران میں ایس ایس وائسرائے آف انڈیا (جہاز) کے عرشے پر سپردِ قلم کی گئی تھی، ان اشعار کے لکھتے وقت میرے تاثرات کیا تھے؟ یہ وہی جان سکتا ہے جس نے کبھی چاندنی راتوں میں سمندر کی سطح پر مغربی حُسن کو گھنٹوں مصروفِ رقص دیکھا ہو! شعر، موسیقی، رقص باہمی امتزاج کے سبب ایک دوسرے سے بیحد پیوستہ ہیں، شعر موسیقی کے بغیر شعر نہیں کہلا سکتا! نہ موسیقی رقص کے بغیر موسیقی!! کیا پیمانۂ شعر کی اکائی پیمانۂ رقص کی اکائی سے شمار نہیں ہوتی؟ عربی بحور رفتار ہی کے مظہر ہیں، انگریزی عروض کے سلسلے میں بھی Feet (پاؤں) کا لفظ رائج ہے جسے آلۂ رقص کہنا چاہیئے، میں نہیں کہہ سکتا کہ میں محاکاتِ رقصیہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں تاہم مجھے آہنگِ نظم کی "رقصیت" کا ایک گونہ اندازہ اس وقت ہوا جب میں نے لندن کے ایک جمیل

اجتماع میں اس کے اشعار ایسے سامعین کے سامنے پڑھکر سنائے جو مفہوم الفاظ سے قطع نظر sound (آواز) کی صلاحیت کے بہتر مبصّر ٹھہرائے جا سکتے تھے، چنانچہ چند ایک ممتاز خواتین شاہت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں ؎ (لطیفی)

ہلکا سا جہاز خراماں ہے امواج کے دوشِ رنگیں پر
یا کوئی حباب مچلتا ہے اِک خواب کی جوئے سیمیں پر
میں ڈک کے روپہلی دامن پر اِک گنج سرور انگیز میں ہوں
انبوہ جمال و جنبش کی عریانیٔ نزہت ریز میں ہوں
خوش رنگ جہاز کی سطحوں پر بھرپور جوانی رقصاں ہے
یا نرم کنول سے ہونٹوں پر پُر کیف تبسّم لرزاں ہے
یُوں حُسن کی رنگیں پنکھڑیاں شاداب نشاط پہ مائل ہیں
لغزش کے کنارے چُھوتی ہیں تکمیلِ بہار کی سائل ہیں
ہر پائے حسیں کی ٹھوکر سے اِک فتنہ جگایا جاتا ہے
رفتار کی ہر اک لرزش سے اِک حشر اُٹھایا جاتا ہے

اندام جھکائے جاتے ہیں لوچ اور لچک کی لہروں سے
خود جھوم رہی ہے فطرت بھی اس رقص کو دیکھ کے پہروں سے
شوخ اور شریری تیزیاں جذبات میں آگ لگاتی ہیں
ہیجان کے مضطر شعلوں سے آسودہ ہوس بھڑکاتی ہیں
زہرہ نے بلند نشیمن پر مضراب چرا کر گردوں سے
کچھ تار بادیں بربط کے چھیڑے ہیں اچھوتے افسوں سے

(اکتوبر ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ رسالہ "راوی" لاہور (مارچ و اپریل ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۵ جولائی ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ رسالہ "المقالہ" سرگودھا (اکتوبر ۱۹۳۲ء)

"پردہ نشیں سے....."

موجودہ تعلیم اور اس کے نتائج کی کشاکش بہت
تھوڑے نوجوانوں کو یہ فرصت عطا کرتی ہے کہ کالج
کے بعد وہ کسی علمی و ادبی ذوق کو برقرار رکھ سکیں، اور
ملک کے لٹریچر میں نابلقدر اضافہ کرکے آیندہ نسلوں کو مزید
علمی شوق کی ترغیب و تحریص دلا سکیں، فکر معاش انھیں یقیناً
مجبور کردیتی ہے کہ وہ اس قسم کی تمام کوششوں و کاوشوں سے
یکسر الگ ہوجائیں، جن کا حشر ہندوستان ایسے غلام آباد میں
... "خیال ست و محال ست و جنوں"... کا مصداق ہے،
شعرائے اردو میں غالباً ڈاکٹر اقبال ہی وہ پہلے خوش نصیب شاعر
ہیں جنکو فلک پیما تخیل کے صدقے میں سر کا خطاب عطا ہوا ورنہ عام
طور پر حکومت کا دامن شعر نوازی کی تر دامنی سے بالکل خشک ہی نظر آتا ہے،
جناب محمد حسن صاحب لطیفی بی۔اے، ایم۔اے (فائنل) علیگ

اُن معدودے چند فارغ التحصیل نوجوانوں میں سے ہیں جنکی تشنگیِ علم ہر وقت و ہر ساعت ھل من مزید کا ہنگامہ گرم رکھتی ہے باوجودیکہ آپکے اس ذوق کو "کاروبار" کے مقابلہ میں مطعون بنانے کی پیہم کوششیں ہورہی ہیں، مگر قدرت کی جانب سے جو کچھ ودیعت ہوچکا ہے وہ آپکو تخیل کی فضائے بسیط میں محو پرواز رہنے پر یہاں تک مجبور کررہا ہے کہ اس کے سامنے ہر مجبوری معذور دکھائی دے رہی ہے "اصلاح" کا باب نظم آج آپ کے "خطاب لطیف" سے فتح ہوتا ہے اور وہ بھی جنس لطیف کے ایک ایسے رکن سے، جو عالم خلوت میں ہوتے ہوئے جلوت کدۂ عالم کو ایک شعلہ زار بنائے ہوئے ہے،" (اشہر — مدیر "اصلاح" لدھیانہ)

یہ رسمِ حجاب اب تم رہنے دو نہ شرماؤ

صد ہوشربائی سے صد جلوہ فروش آؤ

دیکھو تو ان آنکھوں کا اندازِ پذیرائی

یا جذب انھیں کر لو یا ان میں سما جاؤ

لو بند میں کرتا ہوں پلکوں کو تصوّر میں
اب دیکھ نہیں سکتا آنا ہو تو آ جاؤ
یوں رُوح تصوّر کی گہرائی میں ڈوبی ہے
جس طرح سمندر میں کھو جائے کوئی ناؤ
کیوں نُور کی کرنوں کا اک عکس نمایاں ہے؟
گر تُم نہیں ضو گستر پھر کون ہے بتلاؤ؟
یہ زود شکست افسوں رہنے دو ابھی طاری
کچھ دیر شعاعوں کو اِس رنگ سے جھلکاؤ
محویّتِ یکسُو کو یُوں کرکے پریشاں تم
اس خوابِ درخشاں کا نقشہ نہ مٹا جاؤ
جاتے ہو تصوّر سے کیوں جلوہ گری کرکے
تم پردہ نشیں ہو گر پردے نہ اٹھا جاؤ
رنگین حجابوں میں آسودہ ہی رہنے دو
صہبائے تبسّم کو اِس طرح نہ چھلکاؤ

بالیدہ تمنّائیں مغرور نہ ہو جائیں

شاداب نگاہوں کے یوں پھول نہ برساؤ

اک مستیٔ استغنا آجائے نہ جھونکوں میں

یوں سانس کی موجوں سے تم انکو نہ مہکاؤ

طوفانِ بہار انکی آغوش میں سوتا ہے

یوں تازہ امیدوں کی کلیوں کو نہ چٹکاؤ

لغزش نہ کہیں مجھ سے بیساختہ ہو جائے

رعنائیٔ لذّت سے اس دل کو نہ بہکاؤ

عریاں ہی جو ہونا ہے پھر کیوں ہو گریزاں تم

دکھلا کے جھلک اپنی یوں مجھکو نہ للچاؤ

پردے جو اٹھائے ہیں ملنے بھی دو اب مجھکو

اپنی ہی خودی کو تم حسرت میں نہ تڑپاؤ

(اوائل اکتوبر ۲۹ء)

مطبوعہ جریدہ "اصلاح" لدھیانہ (۲۰ اکتوبر ۲۹ء)

"ن ۔ ۔ ۔" کی تصویر

شب کو یادِ "ن ۔ ۔ ۔" میں جب رو کے کھو جاتا ہوں میں
سر جھکا کر خواب زا بالیں پہ سو جاتا ہوں میں

اُس کی تصویرِ حسیں رہتی ہے یُوں پرتو فگن!
خوابِ تنہائی میں پاتا ہوں میں لطفِ انجمن!

کپکپائی لرزشوں سے کانپتے ہیں اُس کے لب
اور خموش آواز آتی ہے "کہو مجھ سے کچھ اب"

پیاری آنکھوں سے نکل کر اک تبسم فام ضو
میری پلکوں تک اُتر آتی ہے بن کر ایک رَو

چُپکے چُپکے مُجھکو دیتے ہیں پیام دلنشیں
خطّ و خالِ مرتسم کے نقشہائے مرمریں
نیم وا رہتی ہے کھڑکی خوابگہ کی رات بھر
چھاؤں سی چھائی ہوئی تاروں کی نزدودُور پر
آہ! پھر وہ چاکِ شب اور زُود افزوں ہاؤ ہُو
ڈوب کر لب تشنہ رہ جاتی ہے نوائی گفتگو

نینی تال
۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ"
(۲۹ر جولائی سنہ ۳۲ء)



کیوپڈ اور اُس کا ہمصفیر

(”ساقی“ نمرہ مارچ ۱۹۳۳ء (دہلی) میں ایک تصویر دیکھکر)

عشق کا وہ خوبصورت دیوتا
تیر ہوتا ہی نہیں جس کا خطا
ایک پُر اسرار پائیں باغ میں
سنگِ مرمر پر ہے یُوں بیٹھا ہُوا
اس کے دہنے ہاتھ میں ہے اک کماں
دستِ چپ ہے بائیں شانے پر جُھکا
اور اُس کا ایک کمسن ہمصفیر
اُس کے زانو پر ہے بیخود سو رہا
پر ہیں کیوپڈ کے بُلند اس طور سے
دلکش انگڑائی کا منظر ہے کِھنچا

تیر کچھ بکھرے ہوئے گھاس پر

پاؤں کے پاس ایک ترکش ہے پڑا

ناوکِ اندازِ محبت کی نگاہ

دلنشین، دلنواز و دل رُبا

جسم ہیں دونوں کھلنڈروں کے صبیح

صورتِ غلمان کافر ماجرا

حُسن کی مینا کے ہیں گویا دو لخت

ایک چھوٹا ریزہ ہے اور اک بڑا

بے نیازِ پردہ دونوں کی نمود

یعنی فطری پیرہن اُن کی قبا

ایسے بھونرے ہیں وہ جنکے سانس سے

رس ٹپکتا ہے کلی کے ہونٹھ کا

چٹکیاں لیتی ہے اُنکے گرد و پیش

موسمِ لذّت کی البیلی صبا

یا ہے آویزاں نظر کے سامنے
خوابگوں بادل کی ہلکی سی گپھا

لوچ میں ہے جس کے لوری کا فسوں
جسکے دامن میں ہے جھولے کا مزا

دو حباب اس سادہ پنگورے میں ہیں
ایک بے خواب اور اک خواب آشنا

کوئی دیکھے انکے یہ رازو نیاز
کھو کے پایا ہے انھوں نے جانے کیا!

۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ اپریل ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۳۱ جولائی ۱۹۳۳ء)

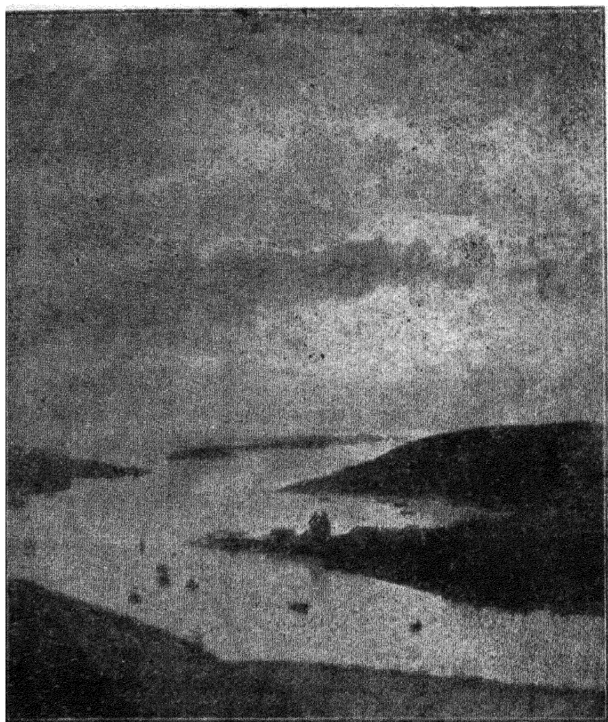
مناظریہ



مشاہدہ

(شیٹ لینڈز کے افق پر آفتاب کی آخری شعاعیں)

کوئی ویران سا کنارا ہے
ایک سنسان سا نظارا ہے
دُور تک پاٹ ہے سمندر کا
گوشہ پھیلا ہوا ہے منظر کا
مہرِ روشن جبیں ہے رُو بہ غروب
چاکِ گیسوئے ابر میں محجوب
عکس پڑتا ہے یُوں شعاعوں کا
سینہ جھلمل ہے آبناؤں کا
رود باروں کے تیرہ گوں ٹاپو
جو ہیں اک دُوسرے کے ہم پہلو



عالمِ تیرگی سے حیرت خام
ہیں سکوں زار میں سکونِ آشام
چرخِ آزردہ کی سیہ پوشی
شامِ حرماں کی ہے الم کوشی
گاہے خالی ہے وہ سیاہی سے
گاہے بادل ہیں اس پہ کاہی سے
رنگ ناپید بھی ہے پیدا بھی
سانولا پن بھی ہے اُجالا بھی
بدلیاں روشنی پہ چھائی ہیں
جو شعاعیں ہیں چھن کر آئی ہیں
ایک اقصائے خاکنائے پر
کوہ کے حاشیئے کے سائے پر
کوئی موہوم سا شبستاں ہے
عبرت آثار کاخِ ویراں ہے

غم بھرا سانس ہے ہواؤں میں
ایک اندوہ سا فضاؤں میں
شکل کہنتی ہے تیرہ خانے کی
یہ کڑی ہے کسی فسانے کی
بُرجِ شبگوں سے غم ٹپکتا ہے
اور کلس آسماں کو تکتا ہے
اسکے گھڑیال کی صدا ہے خموش
اک طلسمِ سکوت حیرتِ گوش
تھک کے خورشید کی نگاہ ذلیل
ہو رہی ہے ظلال میں تحلیل
کوئی قندیل بھی نہیں رخشاں
سب دریچے ہیں تیرہ و ویراں
یادِ گمنام کا نشاں ہے کوئی
عقبِ ساحل کی چیستاں ہے کوئی

خال ہائے رُخِ فسردۂ آب

سطح پر رُو نما ہیں مثلِ حباب

یعنی بط ہائے جرعہ نوش دُخاں

زاویوں میں کہیں کہیں ہیں رواں

اُف یہ منظر کی وسعتِ آغوش

یہ نگاہوں کی فرصتِ خاموش

جُھٹپٹا ہے بہت عجیب و غریب

آہ ساحل کی ندرتِ ترتیب!

(۲۴ مارچ ۱۹۳۳ء)

مطبوعۂ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ اپریل ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۳۰ جون ۱۹۳۳ء)

مژدۂ تبسّم

ضمیرِ غنچہ میں لیتی ہے چٹکیاں جو اُمنگ
اب آشکار کرے گا اُسے شباب کا رنگ
جھلکنے والی ہے پنہاں شگفتگی کی نمود
وہ رنگ و بُو کی گرہ ہے اُمیدوارِ کشود
نثارِ ضبط سے معصوم و خوشگوار گریز
کنارِ پردۂ غنچہ میں ہے انبساط انگیز

(اپریل ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (جون ۱۹۳۰ء)

ڈک پر ایک شام

(ایس۔ ایس وائسرائے آف انڈیا (جہاز) میں عدن پہنچنے سے ایک روز پہلے)

یہ چھٹپٹا گلابی یہ شام ماہتابی

یہ احمریں شفق کی مستانہ بے حجابی

اک دلفریب و دلکش تصویر سامنے ہے

اک خواب آرزو کی تعبیر سامنے ہے

بادل کے چند ٹکڑے کروٹ سی لے رہے ہیں

خاکی فضا کو رنگیں پیغام دے رہے ہیں

انداز بیخودی سے بہکے ہوئے ہیں جھونکے

آوارہ نکہتوں سے مہکے ہوئے ہیں جھونکے

سیمیں خطوط بن کر مہتاب کی شعاعیں

امواج مرتعش کی لینے کو ہیں بلائیں

اک رقصِ مضطرب سی مستی میں جھومتی ہیں
کس پیار سے لگن سے لہروں کو چومتی ہیں
انگڑائیاں سی لیکر بیتاب ہو گئی ہیں
موجوں کی بربطوں پر مضراب ہو گئی ہیں
ڈوبی ہوئی ہیں لہریں آپس کی الفتوں میں
سرگوشیاں ہیں جاری آسودہ خلوتوں میں
شوخی سے اک ستارہ گردوں پہ ہنس رہا ہے
اک خوشنما ستارہ گردوں پہ ہنس رہا ہے
فطرت کے یہ کرشمے دل کو لبھا رہے ہیں
خوابیدہ ولولوں کو جنبش میں لا رہے ہیں

(۷ر اکتوبر ۱۹۳ء)

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (نومبر ۱۹۳ء)

چاندنی رات

کی

ناتمام جھلک

پُرکیف و شاداب

رشکِ مے ناب

رعنا و رنگیں ہا

مہتاب آگیں

تاروں بھری رات

نیلم پری رات

عشرت چکاں تھی

مستی فشاں تھی

ہر تارِ مہتاب

لرزاں بہ مضراب

تھی زمزمہ ریز

یا نغمہ انگیز

ششگیر تانیں

گمبھیر تانیں

ہلکی، رسیلی

نازک، نشیلی

موسیقیوں سے

یا لوریوں سے

کرتی تھیں مدہوش

از خود فراموش

سیمیں ستارے

یا سیم پارے

سوئے ہوئے تھے

کھوئے ہوئے تھے

خوابِ ضیا میں
زرّیں فضا میں
کیا دیکھتا ہوں
بالائے گردوں
تاریک سائے
اٹھ اٹھ کے چھائے
لوحِ حسیں پر
شب کی جبیں پر
وہ پیارے پیارے
مخمور تارے
اُن بادلوں میں
یا آنچلوں میں
کرنیں ڈبو کر
روپوش ہو کر

ضَو کھو چکے ہیں
گُم ہو چکے ہیں
شب ہے اُداس اَب
چھائی ہے یاس اَب
غمگیں سماں ہے
حسرت چکاں ہے
مصروفِ ماتم
اک چشمِ پُر نم
منظر پہ طاری
ہے سوگواری

(مارچ ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ "نیرنگِ خیال" لاہور (اپریل ۱۹۳۰ء)

سمندر کی طوفانی شام

سرد موسم ہے ہوا ہے تیز و تُند
چھائی جاتی ہے گھٹا کی طرح دُھند
کشتیِ نازک ہے تھرائی ہوئی
درمیاں منجدھار کے آئی ہوئی
چند تو دوں میں جو تھے باہم دگر
ہیں وہ آبی گھاس پات اب منتشر
لو اُمڈ آئی وہ آندھی ناگہاں
اب پھٹے پڑتے ہیں سارے بادباں

مرتعش نبضوں میں ہیجان آگیا

مضطرب لہروں میں طوفان آگیا

ناؤ رکھ لی گود میں سیلاب نے

اور گھما ڈالا اُسے گرداب نے

چھوٹتے جاتے ہیں چپّو ہات سے

جا ملے ہیں گر کے بہتے پات سے

یُوں کھلونا بن گئی یکلخت ناؤ

کھیلتا ہے اُس سے طُوفاں کا بہاؤ

اِک دُھندلکا سا اُفق پر آگیا

ڈھل گئی شام اور اندھیرا چھا گیا

ناؤ کیا خطرے میں ہے خود ناخدا

گونجتی ہے بے نواؤں کی دُعا

خوف زا ہے اُس کی صوتِ بازگشت

ہو نہ کشتی کی وہ آہنگِ شکست

چاک دامن ہے کچھ ابرِ برشگال
ٹمٹماتے ہیں ستارے خال خال
جھلملا جاتے ہیں یوں کرنوں کے تیر
جیسے جگنو کے گذرنے کی لکیر
سیل تھم جائے تو ہو رستہ عبور
رات طوفانی ہے اور ساحل ہے دور

(۸ر مارچ ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ر اپریل ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۱۳ر اگست ۱۹۳۳ء)



مہتابِ زمستاں

(بے قافیہ)

یہ سکوت، یہ زمستاں
یہ گھٹا، یہ نہر، یہ پُل
یہ فضا، یہ منظرِ شب
یہ سڑک، یہ شہر کی حد
یہ مہیب سے شبستاں
یہ گراں فسردگاہیں
یہ محل نما مکاں ہیں
کہ بلند و پختہ خیمے
کہیں تین منزلیں ہیں
کوئی چار منزلہ ہے



وہ جو متصل مکاں پر
نظر آ رہی ہے بُرجی
کہیں رہ گئی ہے نیچے
کلسوں سے پست ہو کر
وہ چھتیں مثلّثیں سی
وہ کلیسائی پُشتے
وہ کُہن کدے کہ جن پر
ہیں نقوشِ بے ثباتی
وہ بلندیوں پہ غرفے
وہ عمارتوں کے روزن
وہ چڑھاؤ کھڑکیوں پر
وہ بلند بارجے سے
ہیں وہاں پہ چلمنیں سی
کہ پڑے ہوئے ہیں پردے

یہ پڑے ہوئے ہیں پردے

کہ چراغ ہو گئے گُل

اُدھر آسماں پہ دیکھو

وہ سماں غنودگی کا

ہے سماں غنودگی کا

کہ مہک سی چاندنی کی

مہِ مضمحل کی گویا

پلکیں جھپک رہی ہیں

کہیں چھا رہے ہیں چھالے

کہیں چاند جھانکتا ہے

نگہ اب سڑک پہ ڈالو

ہے کشادہ جس کا پہلو

یہ بتا رہی ہے ندّی

کہ جھڑی لگی تھی ہم جھم

مگر ابر کہہ رہا ہے

ابھی اور بھی ہو جل تھل

یہ مینہِ خنک کی ٹھنڈک

یہ طلسم نقرئی سا

یہ جھلک سی بدلیوں میں

یہ تراوشیں روپہلی

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی

یہ برودتِ شبِ یخ

یہ خزاں کی رُت، یہ پت جھڑ

یہ ہوا کی سائیں سائیں

یہ خموشِ نخل ہے یا

کوئی بے زبان دربان

یہ مکاں کی پچھلی منزل

کہ ہے شمع جس میں روشن

جو اس انتظار میں ہے
کہ پناہ دے کسی کو
لبِ شاہرہ کے خم پر
درِ نیم وا کے آگے
کوئی بھیک مانگتا ہے
سفر و مسافری میں
یہ خزاں یہ جوئے سرما
یہ گداگیِ بے نوائی
ہمہ اہل شہر یہ گو
ہے فسونِ خواب طاری
مگر اک صدا سی اب بھی
شبِ مہ میں گونجتی ہے!

(۱۲؍اپریل ۱۹۳۳ء)

قلمکار (۱۴؍اپریل ۱۹۳۳ء)

"ہنی[1] مون" کی ایک رات

شمعِ خوش تاب و خوش آئند کی کرنیں جھلمل
جن سے آراستہ عشرت کدہ مہمانوں کا
روح کھنچ آئی سی چند ایک حسیں راتوں کی
عطر کھینچا ہوا سا وصل کے افسانوں کا
تم بھی ہو، تخلیہ بھی، سیج کی گل پوشی بھی
مہرباں دیوتا دونوں پہ شبستانوں کا
پیار کرنے میں جو کھل جائیں تمہاری زلفیں
عالم اُف کیا ہو مرے بازوؤں اور شانوں کا

---

[1] (HONEY-MOON)

لذّت اندوزیٔ باہم کا یہ نایاب سُرور
راز سربستہ ہے فطرت کے نہاں خانوں کا
آؤ مل کر پیئیں شمپین کے رنگین گلاس
رُتجگہ[۹۲] مے کا ہے یہ جشن ہے پیمانوں کا
چھیڑ کر سازِ طلسمی کو نہ مضراب رُکے
ہمنشیں کھو نہ پائے یہ مزہ تانوں کا
اپنے زانو پہ مجھے آج تو مرجانے دو
یہ ہے معراج مرے مرتعش ارمانوں کا

(۴ اگست ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۹ اگست ۱۹۳۲ء)

Gala Night ۹۲

بادۂ افشانی

روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی گیتی سے گردوں تک
مسرّت خیز کرنوں سے نگاہِ شادماں بیخود

فلک پر زہرہ دیر دیں طلسم شب سے کیف آگیں
شبستانِ ثریّا، خواب گاہِ کہکشاں بیخود

نشاط آموز بحرِ نیلگونِ چرخ کا منظر
برنگِ جامِ صہبا ہر حبابِ نمو فشاں بیخود

درخشاں قمقموں کی ضو میں محویّت ہی محویّت
ستاروں کی ضیا سے آسماں کا آسماں بیخود

گلوئے مطرب آہنگِ طرب سے سازشِ آبادہ
ربابِ عیش سے مضراب کی سرگوشیاں بیخود

مئے نارنجِ فام آلودۂ غلطیدنِ رنگیں[51]
لطیف اور خوشنما لہروں کا رقصِ ارغواں بخود[52]
شبابِ گُل میں مستی اور خرامِ موج میں مستی
بہار اندوز گلشن کی طرح جوئے رواں بخود
نشیلی خوشبوئیں آوارہ فردوسِ تبسم میں
نسیمِ تازہ کا ہر موجۂ نکہت رساں بخود

---

[51] اور [52] Transferred Epithet

(یکم نومبر ۱۹۲۹ء)

مطبوعہ جریدۂ "اصلاح" لدھیانہ (۳ نومبر ۱۹۳۱ء)

کین وڈ میں خزاں

(بے قافیہ اور بے ضافت)

"کین وڈ میں خزاں" اُس نہ بھولنے
والے زمانے کی مختصر سی یادگار ہے۔
جب میں لندن کی ایک آئرش حسینہ کے
دامِ گیسو میں اسیر ہو کر سوادِ شہر کے مغربی
کنارے پر خزاں نصیب "کین وڈ"
کو محرمِ درد سمجھکر، اس خیال سے کہ شاید

KEN WOOD
(Hampstead Heath)

ا ل

میرا غم نصیبِ دلِ اشتراکِ حرماں سے
کچھ اکتسابِ تسکین کر سکے، جنگل میں
دائیں بائیں اور رہا کرتا تھا جیسے کوئی غلطاں
و پیچاں منظر کی بھول بھلیاں میں کھو جانا
چاہتا ہے ـــــ جب ستمبر ۱۹۳۱ء کی
ایک شامِ ملیح کے شفق نگار تبسم سے
کیف بداماں صحبتِ ریسٹوران میں
مجھے ایک فرمائش حسین پر اس نظم کا
انگریزی ترجمہ پیش کرنا پڑا تو میں نے یہ محسوس
کیا کہ چند غیر مرئی انفاس نے اس میں
شعریت پھونک دی ہے، اور اگر پہلے یہ
پارۂ ہذیانِ ادبی کا ایک مہمل خاکہ تھا تو
اب ایک پُر معنی، اور رنگین، پاکیزہ اور
لطیف نقشِ ادب! ـــــ ہر چند

اس نظم میں نہ قافیہ ہے نہ ضخامت
مگر مرے نزدیک یہ سلیس،
نودرد، پاکیزہ اور فطری شاعری
کی حامل ہے اور آج مجھے یہ راز
افشا کر دینے میں تامل نہیں کہ گو
آج تک میں نے اس سے بہتر نظمیں
بھی لکھی ہیں لیکن اُن سب سے میں اسکو
عزیز تر سمجھتا ہوں.........

....

....

............لطیفی

یہ پریشاں پھول مرجھائے ہوئے
یہ نشیب افتادہ پنکھڑیاں نڈھال

سرنگوں شاخوں کے یہ پژمردہ برگ
پتّیاں یہ بےکسی سے داغدار
سبزہ یہ دامن میں کچھ آنسو لئے
اور یہ بے روپ غنچے مضمحل
پاؤں سے لپٹے ہیں ہمدردی کیساتھ
رل رہے ہوں جیسے باہم سینہ چاک
دور کین ووڈ میں نکل آیا ہوں میں
چھوڑ کر آبادیوں کی شورشیں
دل کی بیتابی پہ بس چلتا نہیں
یہ لئے پھرتی ہے اس جنگل میں یوں
بھول جائے کوئی رہرو جس طرح
جنگلی پگڈنڈیوں میں راستہ
ہے گراں اس دل پہ آہوں کا ہجوم
اور ان آہوں میں ہے "ن..." کا غم

آہ! وہ دن ... کہ جس کی آرزو
موت کے اس پار بھی تڑپائے گی
لے گئی پہلو سے تسکیں چھین کر
ڈھونڈتا پھرتا ہوں جس کو صبح و شام

(لندن موسم خزاں ۱۹۳۱ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۶؍ اگست ۳۲ء)



میرے خوابوں کی بستی

جہاں وارفتہ ہے وجدانِ مستی
جہاں آسودہ ہے آشوبِ ہستی
وہیں ہو گی مرے خوابوں کی بستی
دھنک کی کامنی سی ہیکلوں میں
جہاں گُم ہے شفق کی شوخ دستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی
جہاں چھٹکی ہوئی سی چاندنی میں
ہیں پھواریں عطر کی چھم چھم برستی

وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

جہاں وہ کھیلتے ہیں جھائیں مائیں
جنھیں کہتے ہیں تارے اہلِ بستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

جہاں بھیگی ہوئی راتوں کی شمعیں
ہر اک شب خندہ ءِ تو سے ہیں ہنستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

جہاں بہکے ہوئے سے بادلوں میں
اُڑی پھرتی ہے روحِ مے پرستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

جہاں جادو بھری شاما کی چہکیں
نہیں غم میں اُلجھتی اور پھنستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

کنول کھلتے ہیں اس کثرت سے جس جا

کہ شادابی ہے مٹی سے بھی ہستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

سماتا ہے مساموں میں جہاں رِس
ٹپکتی ہے جہاں مستی ہی مستی
وہیں ہوگی مرے خوابوں کی بستی

جسے دیکھا نہیں اب تک کسی نے
فضا جس کی ہے جہاں کو ترستی
وہی ہوگی مرے خوابوں کی بستی

(۲۰ جنوری ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ اپریل ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ جریدہ "جریدہ" لاہور (اواخر جنوری ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۲۵ مئی ۱۹۳۳ء)

سروِ خود رَو

آزادیِ نُمو ہے
مَیں ہوں اَور آبجُو ہے
اِس کی خُنک روانی
ہے کِس قدر سُہانی
افزائشِ نم و گِل
آسائشِ مسلسل
کہسار کے صنوبر
یُوں تو ہیں میرے ہمسر
اُن میں کہاں یہ رافت
کیفیّتِ لطافت
میں سروِ خوشنما ہوں
دِلکش ہُوں دِلکشا ہُوں

فطرت کی جو روش ہے
ویسی ہی پرورش ہے
رکھتی ہے میری قامت
موزونیٔ ضخامت
قدرت نے یوں تراشا
مخروط سا سراپا
حدِّ فشار سر ہے
پھیلاؤ تا کمر ہے
خود رو بہار میری
زیبا نگار میری
میں مثلِ نصف بیروں
بندی میں مرتسم ہوں
امواجِ شیشہ گوں کا
سیّال آئنہ سا

سرو نگوں کا منظر
اک دامنِ مُشجّر
جو میرا شاخ چیں ہے
صَوّاعِ ہمنشیں ہے [1]
شاخوں کی سبز فامی
لہروں کی خوش خرامی
یوں رہ میں جلوہ گر ہے
دامن کشِ نظر ہے
شفاف و صاف پانی
اور اس میں عکس دھانی
یہ گوشہ دیدنی ہے
آسودگی گھنی ہے

---

[1] ڈھالنے والا

پرداخت اس فضا کی
اور تربیت صبا کی
اک شعریت لئے ہے
رومانیت لئے ہے
ہو اوس مجھ پہ طاری
یا شب کی ژالہ باری
میں تازگی بداماں
رہتا ہوں شاد و فرحاں
آزاد ہوں خزاں سے
بے مہریٔ جہاں سے
یہ بَن مرا چمن ہے
غربت مرا وطن ہے

(۲۴ر فروری ۱۹۴۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ر اپریل ۱۹۴۳ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۱۰ر جون ۱۹۴۳ء)

فلسفیانہ اور سائنٹفک



مجبوری

پروفیسر جون ای ڈاؤنی نے حال ہی میں تنقید ادبیات

کے موضوع پر ایک زبردست کتاب

"Creative imagination"

یعنی "زائی تخیل" کے نام سے تصنیف کی ہے،

جس میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے :-

"الفاظ اضطراری کیفیتوں (moods) کے

لحاظ سے کم عیاری یا بیش عیاری کے حامل ہوتے ہیں

جس کا تعین نازک جذباتی (تمثیلی) اشکال و اسالیب

کو دعوتِ نہضت دینے کی صلاحیت سے کیا جا سکتا ہے" میں اس نظریہ سے ایک نظریۂ معکوس اخذ کرنے کی جرأت کرتا ہوں وھو ھذا :-

"اضطراری کیفیتیں خود بھی کم عیار اور بیش عیار ہو سکتی ہیں اور اس امر کے تعین کا انحصار ان الفاظ کی کم عیاری یا بیش عیاری پر ہے جو کسی کیفیت کے دوران میں بے اختیار مُنہ سے نکل جائیں اور انھیں کسی نہ کسی طرح گرفتار کر لیا جائے"

چونکہ مجھ سے موضوعِ "مجبوری" پر ایک "موڈ" کے دوران میں نظم لکھی گئی، اس لئے میں "ہمت شکنی کا مجرم" قرار نہیں دیا جا سکتا اور "گنجایشِ عمل" یا "ذمہ داری کے تعین" کا سوال بھی خارج از بحث ہے رہا یہ سوال کہ میرے اشعار اُس "موڈ" کی بازگشت ادا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہونگے؟ اس کا اندازہ قارئین "مطالعہ"

پر چھوڑتا ہوں ـــــــ (لطیفی)

اے دل اس افتادہ بستی کی نگونساری نہ پوچھ
یہ مکیں مجبور ہیں اور یہ مکاں مجبور ہے
ذرّہ ذرّہ ہے گرفتارِ ہبوطِ اولیں
رفتہ طرزِ رم سے گردِ کارواں مجبور ہے
ارتقائے دہر کیا ہے؟ حدِّ ناکامی کا نام
کامراں مجبور ہے ناکامراں مجبور ہے
اضطراری زندگی پر آہ کیسا اختیار
خفتہ رجحانات سے سارا جہاں مجبور ہے
گردشیں خوئے اسیری سے ہوئیں خود بھی اسیر
چارۂ رم سے رمِ سیارگاں مجبور ہے
سرفرازی بھی نہیں تسلیم آئیں سے بلند
خاکدانِ تیرہ کیا، دیکھ آسماں مجبور ہے

(۱۲ اپریل ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ اپریل ۱۹۳۲ء)

اُولوالعزمی

اے کہ تو وابستہ ہے زنجیرِ استعمار میں
دیکھ اک راہِ شکستِ حلقۂ جولاں بھی ہے!

"شانۂ" "پرِ عنقا" کا دھوکا ہے تجھے ابہام سے
آزما کر تو ذرا دیکھ اس "نہیں" میں "ہاں" بھی ہے!

ہو رہا ایک طرفہ کیوں بیم و رجا میں تیرا ظن
اس طرح گر ہے یہ ممکن دوسرا امکاں بھی ہے!

خوگرِ تسلیم ہونے میں ہے تیری خودکشی
تو اگر خوددار ہو تو پھر وقارِ جاں بھی ہے!

قلب ہے واماندہ جبتک سرِ رگِ ساعد ہے شل
تیرا بازو ورنہ دیوار افگنِ زنداں بھی ہے!

چھیڑ دیتی ہے جو صف ہائے قشونِ قاہرہ
کوئی شے تو دہر میں جانبازیٔ انساں بھی ہے!
خاک کے پتلے کی قسمت میں ہے ایسا مد و جزر
سازِ در داماں بھی ہے یہ سوختہ ساماں بھی ہے!
تیری لوحِ ذرّہ میں پیوستہ ہیں جسکے حروف
بھولنے والے ازل کے! یاد وہ پیماں بھی ہے!
ظلمتِ افتادگی سے اُٹھ کے آنکھوں میں سما
تیرا حُسن سعی رشکِ یوسفِ کنعاں بھی ہے!
توڑنا زنجیر کا مشکل سمجھتا ہے مگر
ایک عزمِ آہنیں سے توڑ دیکھ آساں بھی ہے!

(یکم نومبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ ضمیمۂ "مطالعہ" لدھیانہ۔ (۲ دسمبر ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۱۳ جنوری ۱۹۳۳ء)

اعتبار

دوست معلوم، دوستی معلوم

اب اس اُلفت کا اعتبار ہی کیا

جو نقاب اُٹھتے ہی بدل جائے

ایسی صُورت کا اعتبار ہی کیا

نگہِ لُطف ان کی ہے تو مگر

اس عنایت کا اعتبار ہی کیا

جب نہ وعدے سے لیں وہ وعدہ مُراد

اُن کی نیّت کا اعتبار ہی کیا

کوئی میزاں ہے اور نہ ہے معیار
قدر و قیمت کا اعتبار ہی کیا

عارضی چاندنی ہیں سیم اور زر
ان کی طلعت کا اعتبار ہی کیا

اِدھر آئے اُدھر چلی جائے
ایسی دولت کا اعتبار ہی کیا

نازک آغاز اور خام انجام
کسی قوت کا اعتبار ہی کیا

کھا چکا ہوں فریب کِس کِس کے
اب محبّت کا اعتبار ہی کیا

جس کا موہوم کیف ہو معدوم
اس مسرت کا اعتبار ہی کیا

عیش کیا ہے؟ سراب عشرت ہے!
اور عشرت کا اعتبار ہی کیا

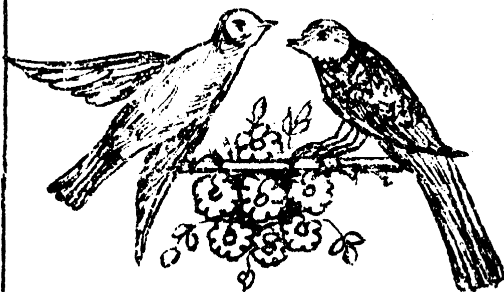
لذتِ غم ہی مجھ کو مل جائے
آہ! لذّت کا اعتبار ہی کیا

صبر کر لوں میں بیکسی پر ہی
ایسی حالت کا اعتبار ہی کیا

میں خراب یقیں تو ہوں لیکن
مری عبرت کا اعتبار ہی کیا!

(اوائل مئی ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ رسالہ "جہانگیر" لاہور (مئی ۱۹۳۲ء)



خیال

(ایک مجسمہ فرض کرکے)

(A symbolic Poem)

اِک جھیل پہ شام چھا رہی ہے
دھندلے آنچل گرا رہی ہے
ہیں ساحل و رودبار تاریک
اور وادی و کوہسار تاریک
روپوش ہے خامشی ہوا میں
آوارہ ہے تیرگی فضا میں
موجیں ہیں خموش اور حباب خاموش
طوفان ہے زیرِ آب خاموش
کچھ دُور ہے اِک سُبک نشاں سا
بہتے بجرے کا بادباں سا

ہلکی ضو جھلملا رہی ہے
کشتی چپکے سے جا رہی ہے
پہلو میں چھپائے اک پری سی
معصوم لطافتوں کی پتلی
نزہت سے بنی ہوئی ہے گویا
شبنم ہی ابھی جمی ہے گویا
حسنِ عصمت کا تازہ مظہر
روحِ عفت کا ایک پیکر
چتون میں ہے کیفِ شب کا عالم
نظروں میں لئے طرب کا عالم
ڈوبی ہوئی سوچ میں جبیں ہے
بیخود وہ نگار مرمریں ہے
پلکوں میں نہفتہ ہے تصور
ہر پردہ میں خفتہ ہے تصور

رُخ پر ہے وہ بادلہ فسوں کا

جس نے نظروں میں سحر پھونکا

لمبے گیسو بکھر رہے ہیں

سیمیں عارض نکھر رہے ہیں

مستی میں شگفتہ حال ہے یہ

دل کا "رنگیں خیال" ہے یہ!

لندن، (جنوری ۱۹۳۱ء)

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (فروری و مارچ ۱۹۳۱ء)



نکتہ ہائے ممکنات

گرچہ ہم ادراک سے ہیں بہرہ ور
خارج از حس ہیں بہت سے خیر و شر
چھو نہیں سکتے ہم ایسے واقعات
چھپکے چھپکے جن کا ہوتا ہے گذر
انقلابوں کے محرک سانحات
ہر طرف کرتے ہیں گردِ مانی سفر
اکثر ان میں سر پہ منڈلاتے ہیں یوں
جیسے پھیلائیں پرندے بال و پر
کچھ ہیں ایسے جو شہابوں کی طرح
ڈوب جاتے ہیں کمندیں پھینک کر

بارہا آتے ہیں بعض ازبس قریب
لیکن اُن کو پا نہیں سکتی نظر
پختہ روپوشی ہے اُنکی پردہ پوش
اور خام اپنی شعاع پردہ در
ہو نہیں سکتا ہمیں احساسِ قرب
خواہ وہ کتنے ہی ہوں نزدیک تر
شاذ و نادر ہم سے مَس ہوتے ہیں چند
رائیگاں جاتے ہیں ورنہ بیشتر
رونمائی اُن کی ہوتی ہے عجیب
گاہے مژدہ گاہے آفت کی خبر
اک نئی تشکیلِ جاں لاتے ہیں ساتھ
آب و گِل پر جب وہ کرتے ہیں اثر

(۱۴؍ فروری سنہ ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴؍ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی - (۲ جون سنہ ۱۹۳۰ء)

نفشی شعاعیں

سائنس کی جس حیرت انگیز ایجاد نے غیر مرئی نقوش کے
مطالعہ پر روشنی ڈالی ہے اس کا راز نفشی شعاعوں
کی عکس ریزی میں پوشیدہ ہے! ــــ لطیفی

وہ نامعلوم تحریریں جو تاریکی میں پنہاں ہیں
جو اک دھندلے سے منظر کی طرح ظلمت بداماں ہیں
مسلسل کاہشیں ہستی ہیں جنکی بے ثباتی پر
پیاپے گردشیں جنکی فراموشی پہ خنداں ہیں
اثر آب و ہوا کا دھوپ اور موسم کی تبدیلی
مٹاکر اصل ہیئت جنکی تسخیر دل پہ نازاں ہیں
وہ آثار ارتقا کی سرگذشتیں ثبت ہیں جن پر
جو صدیوں اور قرنوں کے دفینوں کی نگہباں ہیں

وہ لوحیں دفن ہے جن کی تہوں میں گمشدہ عظمت
سنہری دور کے موتی ابھی تک جن میں غلطاں ہیں
وہ مبہم اور طلسم آگیں کھنڈر جو مضمحل ہو کر
سبک رفتار سائے کے تعاقب سے پریشاں ہیں
وہ نازک ناتواں ذرّے نشاں ہیں مرتسم جن پر
جو سینے کی امانت کے فنا ہونے سے لرزاں ہیں
ابھر آئینگے ضو سے عنقریب اصلی نقوش اُن کے
نگاہیں دیکھ لینگی کس طرح چھپ کر وہ عریاں ہیں
نبفشی رنگ کی کرنوں سے جب وہ جگمگا اُٹھینگے
فضائے تیرگی خود گونج اٹھیگی یہ درخشاں ہیں
جو نامحرم تھے اب تک چشم انساں کی رسائی سے
اب انجم کی طرح اُن کی جبینیں نور افشاں ہیں

(جون ۱۹۳۰ء)

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (جون ۱۹۳۰ء)

آرٹ

نقل کا ہے یہ کمال اصل نظر سے گر جائے
اور جب محو ہو وہ لمحہ تو کچھ یاد نہ آئے

"پنکھڑیاں" (جریدہ مطالعہ)

پوئٹک پالیٹک

(Poetic - Politic)



سرزمینِ رستم و اسفندیار سے خطاب

اے زمینِ رستم و اسفندیار!
اے تہوّر کی قدیم اعجوبہ کار!
یاد ہے تجھکو وہ شانِ احتشام
وہ جُزک وہ طُرّہ ہائے افتخار
تو ظفرمندی سے تھی جب سرفراز
عظمتیں تھیں تیرے قدموں پر نثار
ایک عالم تھا ترے زیرِ نگیں
دُور تک پھیلا تھا تیرا اقتدار

رنگ تھا ایک ایک تیرا سنگِ پارس

زر اُگلتے تھے ترے سب کوہسار

بُجھ چکے ظاہر میں جو آتشکدے

تیری خاکستر میں ہیں انکے شرار

زند و پاژند اب بھی ہیں سینہ پہ نقش

لفظِ زرتشت اب بھی ہے دل پر نگار

شعرِ فردوسی کے ہیں یوں شُعلہ زن

گرم ہے گویا ابھی تک کارزار

اے نشانِ کامرانی کے ندیم!

اے درفشِ کاویانی کے دیار!

اے کہ اس مزدک سے نسبت ہے تجھے

جس نے کی طرزِ مساوات اختیار

اے کہ تیرا جام تھا گیتی نما

کندہ تھے جس پر خطوطِ روزگار

اے قدح خوارِ خراباتِ کہن

اے فروغِ جشنِ جم کی یادگار

سو رہے ہیں تیری خاکِ پاک میں

کیسے کیسے زندہ شہرت شہریار

تیری اک جنت نشاں وادی میں ہے

سعدیؔ شیراز کی لوحِ مزار

اے عمر خیام کے مخمور ملک!

اے شباب و شعر و مے کے رازدار

حافظؔ و جامیؔ کے رنگیں جام سے

سرخوشِ صہبا و سرشارِ خمار

منظرِ البرز سے لبریزِ حسن

زینتِ تبریز کے آئینہ دار

اے رضا شہ کے طلسماتی وطن

چرخ سے ہے جس کا پرچم ہمکنار

جس کی آب تیغ اور دُزدو انگنی
قبضۂ دُزداب سے ہے آشکار
پھر چمن ہوگا ترا سیراب و سبز
لوٹ آئے گی تری رفتہ بہار
وادیاں ہونگی تری مینو سواد
مُسکرائینگے ترے قرب و جوار
مبدار فیاض نے بخشا تجھے
ہوشمند اور باتدبر تاجدار
تیری تمکین اس کا شاہانہ جلال
تیرا پندار اس کا قاچاری وقار
چونک اٹھا تو خواب استعمار سے
اور نوائے شرق سے ہے بے قرار
اب مراعات ان کو مل سکتی نہیں
تیل کے چشموں سے ہے جنکا نکھار

کیا کرے گی پیف زنی اغیار کی

تیری شمعِ بزم سے ہو کر دوچار

اب ملوکیت کا ظالم دیوتا

حرصِ ذہنیت سے ہوگا خوشگوار

گر حریف اب سر اٹھائینگے انھیں

پیس دے گی گردشِ لیل و نہار

اے رضا پرورِ عجم پائندہ باش!

زندہ باد اے ارضِ ایراں زندہ باش!

(اوائل جنوری ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ "زمیندار" لاہور (۲۲ جنوری ۳۳ء)



پغمان

(امان اور ثریا کا سوگوار نشیمن)

آسمانِ مشرق پر چمکنے والے اُس ستارے نے جو ابمغرب کی وادیوں میں غروب ہو چکا ہے، کابل سے ۱۴ سولہ میل دُور اپنی "شعاعوں" سے یہ طلسمی شہر آباد کیا تھا جس پر مغربی سیاحوں کو (Fairy tale city) ہونے کا دھوکا ہوتا تھا"

لطیفی

خوشنما وادی میں زیرِ آسمانِ نیلگوں
چھاؤں رنگیں بادلوں کی جس پہ رنگ افشاں ہے یوں
رَس بھرے ہونٹوں پہ جیسے مسکراہٹ کا فسوں

مرتسم ہے اک تمنّائے سمن چین نگاہ
جس میں عکس افگن ہے کیفِ سحر آگینِ نگاہ
جو مچل کر بن گئی ہے خوابِ رنگیں نگاہ

وہ نشاط آگین سمن زار ایشیا کی جان ہے
شور زار خشک میں شاداب نخلستان ہے
شہر یارِ تجکلہ کی جلوہ گہہ "لغمان" ہے

اِک تبسم زار اُس کے لالہ زاروں کا سماں
اِک ترنم زار اُس کے جوئباروں کا سماں
جانفزا اور روح پرور کوہساروں کا سماں

وہ حسیں بستی ہے یوں سنگیں حصاروں میں اسیر
سربلند و چرخ پیما کوہساروں میں اسیر
نو شگفتہ پھول ہو جس طرح خاروں میں اسیر

مسکراتے ہیں وہاں شاداب نسرین و سمن
رقص پیرا ہے شمیمِ یاسمین و نسترن
کھینچتا ہے دامنِ سیّاح خوش منظر چمن

صُبحدم اُٹھتی ہے فوّاروں کی جب سیمیں پھوار
خواب سے انگڑائیاں لیتی ہوئی مستانہ وار
موتیوں کی بارشیں ہوتی ہیں کیسی خوشگوار

وہ خنک اور تازہ جھونکے کیف اور مستی میں چُور
کر کے آتے ہیں جو برفانی پہاڑوں کو عبُور
نگہت افزا سانس لیتے ہیں فضا میں دُور دُور

نغمۂ رقصِ آفریں کی لے کا دَم بھرتی ہوئی
ناچ میں رقاصہ جیسے پاؤں ہر دھرتی ہوئی
جھُومتی ہے بادِ مست اٹکھیلیاں کرتی ہوئی

مست تانیں گونجتی ہیں وادیٔ کوہسار میں
نغمۂ خوشبو چکاں ہے موجِ نگہت بار میں
کوئی مطرب گا رہا ہے مستیٔ سرشار میں

ڈور سے آتی ہیں راہیں پیچ و خم کھاتی ہوئیں
دامنوں کو اپنے کہساروں سے اُلجھاتی ہوئیں
گھاٹیوں میں سے گذر جاتی ہیں لہراتی ہوئیں

اُن کے لہرانے کا پرتو ہے ترانوں میں بھی کچھ
خام حلقے ہیں یونہی مطرب کی تانوں میں بھی کچھ
پیچ و خم کا ہے لطیف احساس کانوں میں بھی کچھ

کبتک اپنے گیت کی تانیں اُڑائے جائے وہ
روح کو سیلِ مسرت میں بہائے جائے وہ
بے خبر دُنیا سے محویت میں گائے جائے وہ

کوئی دیکھے شامِ ابر آگیں میں چرخِ نیل فام
یوں نظر آتی ہیں رنگیں بدلیاں محوِ خرام
نیلگوں موجوں میں جیسے کشتیوں کا رقصِ شام

پھر تہِ وادی ہے اور اُن نغمہ زاروں کی جھلک
یعنی موسیقی بداماں آبشاروں کی جھلک
ارغوانی خواب سے بیخود بہاروں کی جھلک

ہائے اُن رنگین شاموں کی نشاط انگیزیاں
سبزِ کوہستاں کی گوناگون دِل آویزیاں
دُور میلوں تک شبابِ راہ کی گُل ریزیاں

وہ گذرگاہوں کی دونوں سمت صف آرا چنار
ایک محویّت سی جن کی صُورتوں سے آشکار
یعنی سر سے پاؤں تک طاری طلسمِ انتظار

ہاں اِنہی راہوں سے کوئی شہسوار آنے کو ہے
اک سُنہری گرد ہمراہِ عناں لانے کو ہے
بجلیاں محشر خرام اشہب کی چمکانے کو ہے

(مئی ۱۹۲۹ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالع" لدھیانہ (۲۶) مئی ۱۹۳۲ء

مطبوعہ جریدہ "تازیانہ" لاہور۔ (۱۴) اگست ۱۹۳۲ء

اے سرزمینِ پنجاب!

(وطنی ترانہ)

دیر و حرم کی یکجا محفل کہیں تجھے ہم
لیلائے آرزو کی منزل کہیں تجھے ہم
آوارہ جستجو کا حاصل کہیں تجھے ہم
کیا دِل کہیں تجھے ہم؟

اے سرزمینِ پنجاب!

ایراں کی عیش گاہیں مینائے جم سے رنگیں
اژرنگِ چیں کسی کے اِک مُو قلم سے رنگیں
ہندوستاں ہے لیکن تیرے ہی دم سے رنگیں
شاداب و نزہت آگیں

اے سرزمینِ پنجاب!

چشمے لئے ہوئے ہیں کیسی مٹھاس تیرے
آتے ہیں تجکو کیسے دریا یہ راس تیرے
یہ پاسباں ہیں تیرے بہتے ہیں پاس تیرے
ستلج، بیاس تیرے
اے سرزمین پنجاب!

راوی، چناب، جہلم تیری رگوں میں جاری
انکی خروش آب موجیں ہیں وادیوں میں ساری
وہ شانِ "دیوتیت" ہے ذروں پہ تیرے طاری
سب ہیں ترے پجاری
اے سرزمینِ پنجاب!

آیا ہی چاہتا ہے وہ وقت جب ہوائیں
سرحدِ خیبری سے لائیں سیہ گھٹائیں
غلطیدہ بجلیوں سے جنکی اماں نہ پائیں
یہ ساونی فضائیں
اے سرزمینِ پنجاب!

ایسا وہ کون ہوگا جو پھر تجھے سنبھالے؟

آزادیِ وطن کا پرچم بلند اٹھالے؟

بندوں کے سامنے جو آقاؤں کو جھکا دے

اعلانِ "لا الٰہ" سے؟

اے سرزمینِ پنجاب!

جس کے لئے رہی ہے تو بیقرار اب تک

جس کا تجھے رہا ہے یوں انتظار اب تک

ہوتا نہ جلوہ افشاں وہ ہونہار کب تک؟

ظلمت تھی طولِ شب تک

اے سرزمینِ پنجاب!

وہ ہونہار تیرا اِک خادمِ وطن ہے

قربان تجھ پہ اُس کا تن من ہے اور دھن ہے

گو خار زارِ خدمت دشوار ہے کٹھن ہے

لیکن وہ گام زن ہے

اے سرزمینِ پنجاب!

جو سرگذشت اس کی وہ داستان تیری
تجھ میں ہے جان اُس کی اُسمیں ہے جان تیری
قربانیوں سے اُسکی ہے آن بان تیری
شاہانہ شان تیری
اَے سر زمینِ پنجاب!

(۱۴ر اگست ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ مطالعہ۔ لدھیانہ (۱۹ر اگست ۱۹۳۲ء)



عزمِ انگلستان

جرائد نگاری (Journalism)

کی تعلیم حاصل کرنے کے ارادے سے

ایس۔ ایس۔ وائسرائے آف انڈیا (جہاز)

میں ۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء کو بمبئی کا ساحل چھوڑنے سے پہلے

اجنبیت سی نمایاں ہے در و دیوار سے
ناشناسائی سی پیدا ہے محیط آثار سے
دردمند احباب آتے ہیں نظر اغیار سے
رنج ہے مقصود اس بیگانہ وار اظہار سے
دِل ہی دِل میں ہے ملال اُنکو مرے انکار پر
کچھ بھی بس چلتا نہیں آمادۂ رفتار پر

ہائے میں کیسے بتاؤں کیا ہے معذوری مری
درد بے درماں ہے حسرتناک مہجوری مری
کیا کرو دل ناچار ہے دیرینہ ناسُوری مری
سوئے انگلستاں لئے جاتی ہے مجبوری مری
کس قدر اندوہگیں یہ رخصتی نظّارہ ہے
غم کی ضربوں سے دلِ رنجور پارہ پارہ ہے

دُور ہے منزل مری معمورۂ ہندوستاں!
اور ہی وہ سرزمیں ہے مجھکو جانا ہے جہاں
تو غلاموں کا وطن ہے اے دیارِ بیکساں
تیرے شیون زار میں برپا ہے آشوبِ فغاں
لیکن اُس ارضِ حسیں کے رہنے والے شاد ہیں
جذبۂ حُبِّ وطن سے مست ہیں آزاد ہیں

انبساطِ نو سے عیش افزا ہے انکی ہر اُمنگ
تو ہے بر عکس آرزو کے خون سے رسوائے رنگ
ان کا ہر سانس اپنی جنبش سے ہے رقص آور ترنگ
تیری ہستی کا مگر آئینہ ہے تاریکِ زنگ
کیا پشیماں کر نہیں سکتا ہجوم یاس بھی!
خود فراموشی کا ہے ظالم تجھے احساس بھی

تو اسی دھوکے میں ہے اب محویت طاری نہیں
محفلِ مدہوش تیری مستِ سرشاری نہیں
یوں اسیرِ خواب ہے ہوشِ گرفتاری نہیں
بے خبر تو آشنائے ذوقِ ہشیاری نہیں
کیا اُٹھیں چنگاریاں خاکسترِ افسردہ سے
تو ہے بے پروا ابھی بیداریٔ آزردہ سے

محوِ تحریکِ مسرت ہے ازل سے دل تیرا
گردشِ خوں میں ہے اُسکی دورِ خوں شامل تیرا
پیکرِ اس کا بھی ہے زخمی اگر ہے تنِ بسمل تیرا
اس کی رگ رگ سے ہے ربطِ آمیز مستقبل تیرا
اُنس باہم کو مگر کرتا نہیں محسوس تُو
جو ترے اپنے ہیں ان سے بھی نہیں مانوس تُو

تو یہ سمجھا ہے کہ میں دنیا کوئی بیگانوں میں ہوں
دیکھ! تیرے تشنہء تعمیر ارمانوں میں ہوں
تیری شمعِ زندگی کے تازہ پروانوں میں ہوں
تیری بزمِ خاص کے نشنیدہ افسانوں میں ہوں
سوئے مغرب جا رہا ہوں عزمِ پُر اسرار سے
سیکھ کر آنا ہے مجھ کو کچھ سمندر پار سے
(وسطِ ستمبر ۱۹۳۰ء) قلمکار (۲۷ ستمبر ۳۰ء)
مطبوعہ "خیالستان" لاہور (ستمبر ۱۹۳۰ء)

اندلس کا چاند

میں ذیل کی نظم حسبِ اجازت حضرت علامہ اقبال مدظلہ کے نام معنون کرتا ہوں۔ موصوف زائرِ اندلس ہونے کی وجہ سے میری نظر میں اس انتساب کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہیں یہ نظم ہنوز ناتمام ہے، اس کا بیشتر حصہ فروری ۱۹۳۳ء میں سپردِ قلم کیا گیا تھا۔ ناتمامی کی وجہ سے ابتک یہ غیر مطبوعہ رہی لیکن اس احتمال سے کہ کہیں اس کا نسخہ گم نہ ہو جائے، اب طباعت ناگزیر ہو گئی ہے، اس کا پس منظر (بیک گراؤنڈ) یا بہ اصطلاح جدید "دور نما" ارضِ اندلس کا وہ تاریخی رُخ متصور کیا گیا ہے۔ جو سترھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اندلسی مسلمانوں کی تباہی اور جلاوطنی کی المناک تکمیل کا حامل ہو چکا تھا۔ ویرانۂ اندلس اس فلک پیما سیارے سے جو اسلام کا قومی نشان ہے اپنے اثراتِ قلب بزبانِ حال اس طرح بیان کرتا ہے ——— مطیعی

گئی ہیں اور بھی پہنائے چرخ میں راہیں
تجھے مسافر اسی رہگذر سے آنا تھا؟
خزاں نصیب خرابے کی زد سے ڈرکے گریز
تجھے تو سوئے بہارِ فرانس جانا تھا
جو میرے سوزِ دروں ہی کی آنچ تھی حائل
تو اپنی کرنوں کا دامن ذرا بچانا تھا

رہا ہے یوں تو، تو صبحِ ازل سے سرگرداں
نہاں نہیں تہہِ گردوں کی قسمتیں تجھ سے
وہ مدّ و جزر لیے ہیں ترے طلوع و غروب
بدل گئی ہیں زمانہ کی حالتیں تجھ سے
گذر چکا ہے ادھر سے تو بارہا پہلے
چھپی نہیں مرے ماضی کی عظمتیں تجھ سے

یوں ہی فلک پہ تھا جاری ترا خرام سبک
جب اس کنارہ پہ شاہیں جگر عرب آئے
یونہی تلاش نما تھا ترا طوافِ خنک
جلو میں فتح لئے جب وہ تو طلب آئے
خلیجِ ساحلِ طارق تھی سیمگوں تجھ سے
عبور کر کے وہ صحرا نشین جب آئے

ٹپک رہی تھی اُولوالعزمیوں کی ضو جن سے
تری شعاعوں نے چوما ہے ان جبینوں کو
خدائی آج بھی ہے جن کے نا خدائی محیط
جہان بھر کے مدینوں کو سرزمینوں کو
جنوب مشرقی ساحل پہ تو نے دیکھا ہے
انھیں جلاتے ہوئے آخری سفینوں کو

یہ وہ تھے جنکی نبرد آزمائیوں کی خبر
کھنچی تھی چرم کے کاغذ پہ رازِ خوں بنکر
جو زیرِ قفل رہی جستجوئے رزرک تک
نہیب ہر مردِ آہن میں اک فسوں بن کر
طلیطلا کے قریب ایک برجِ سنگیں سے
جو پھوٹ نکلی تھی کبریت[1] کا ستوں بنکر

وہ اُنکی یورش و یلغار کی پُر آشوبی
کہ اُن کے آتے ہی مغرب میں انقلاب آیا
تجھے بھی یاد ہے ہسپانی صلیب کہ جب
تو خنجرِ مہِ نو بن کے ہمرکاب آیا
طرارہ بھر کے بڑھے "موزِ ناتواں" جسوقت
تو توطس[2] سے نہ توانائی کا جواب آیا

---

[1] گندھک ۔ [2] (Goth)

مبارزت کے دھنی تھے مجاہدانِ جسور
جلال و قہر کی مظہر سپاہ تھی اُن کی
محاذ وادیٔ لک پر کچھ اس طرح جھپٹے
کہ بستِ ولولہ زا بے پناہ تھی اُن کی
تمام بحر و بر اُنکے لئے تھے راہ کُشا!
جہاں گئے وہیں جولانگاہ تھی اُن کی

مری جبیں پہ پھریرا انہی کا لہرایا
مرے بلاد پہ جب تک وہ حکمراں رہے
انہی کا نامہ نہادُ "عزم الامورؔ" سے موسوم
وہ آٹھ سو برس اندلس میں ذی عناں رہے
تو اپنی گردشِ دیرینہ ہی سے پوچھ ذرا
مرے حریم کے کب تک وہ پاسباں رہے

اُنھی کی لمعۂ پرتو سے خیرہ تھی ہر آنکھ
تھے میرے تاج کے لولوئے شاہوار وہی
انھی کے فیض سے میرے نواح تھے سرسبز
تھے اس بہشت کے سرتاج گلعذار وہی
عزیز تھا میں انھیں، اُن کی نکتہ دانی سے
تھے مرے جوہر و خوبی کے رازدار وہی

جو میری گود تھی انمول رنگ و بُو سے بھری
یہ انکی شانِ کرم تھی اُنھی کی بخشش تھی
بنا یہ مُلک جو گہوارۂ علوم و فنون
انھی کا حسنِ عمل تھا انھی کی کوشش تھی
مرے سواد جو شائستۂ حضارت تھے
اُنھی کے نشوِ تمدّن کی یہ نوازش تھی

وہ جوئبارِ حمص[1] کے وہ لورقا کے چمن!
وہ مرغزارِ بطلیوس کی دل آویزی
وہ تاکزارِ سفسطا کی دلفریب فضا
وہ قصرہائے نگاریں کی عیش انگیزی
وہ چاکِ سینۂ اشبیلیہ کی طرفہ بہار
وہ خاکِ وادیٔ اسچوریا کی زرخیزی

وہ نرم سبزہ کناروں پہ رودِ ڈورو کے
جو تاروپودِ زمرّد کا اک بچھونا تھا!
وہ کوہسارِ شمالی کہ جس کے دامن میں
نظرنواز، طرب زارِ ہمپلونا تھا!
وہ البریک کی پاکیزہ و لطیف نسیم
وہ شاطبہ جو نرا خوشنما کھلونا تھا

[1] Seville

مرآندہ کی وہ شرابِ لذیذ و نگہت بار
وہ پیرِ پنیر کا پیرایۂ مے آشامی!
نشیبِ وادیٔ مرشینہ کی وہ شادابی
نجومِ شامِ بلنسیہ کی وہ زر فامی
وہ دوشِ کاکلِ روندا کی عنبر افشانی
وہ شوقِ لذتِ المیریا کی خوش کامی

وہ برگ پوشیٔ برگاس کا نفیس لباس
وہ نو بہارِ زمورا کی تازہ برنائی
لبِ تبسمِ لوسینہ کی وہ تسنیمی
جمالِ لعبتِ جیان کی وہ لیلائی
پری نگاریٔ پرشینہ کی وہ نیرنگی
وہ مرشیہ کی رو پہلی نشاط پیرائی

وہ شانِ منظرِ غرناطہ جس کے جوبن سے
مرے جوانوں کی آنکھوں میں نور آتا تھا

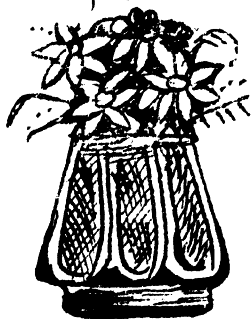
وہ قرطبہ کا حسیں شہر جس کی نزہت سے
تری نگاہوں میں کیفِ سرور آتا تھا

وہ رنگِ وادیٔ عذرا کا نازِ رعنائی
خود اپنے آپ پہ جس کو غرور آتا تھا

(ناتمام)

(فروری ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ روزانہ "مساوات" امرتسر (یکم مئی ۱۹۳۳ء)



وادیٔ نیل سے

ذیل کی تاریخی نظم جو سلکِ جواہر کہلانے کی مستحق ہے لطیفی صاحب کے اس مغربی سفر کے تاثرات کی یادگار ہے جس کے ابتدائی مرحلے میں موصوف نے جہاز سے سویز کی بندرگاہ پر اتر کر زیارتِ قاہرہ اور مشاہدہ اہرام کے شوق میں وادیٔ نیل کی سیاحت فرمائی تھی' (مدیر "زمیندار")

السلام اے طوطِ شیخ آمون کی ارضِ جمیل !
مرحبا اے وادیٔ رفتارگاہِ رودِ نیل
آج مس کرتا ہوں تیرے قطعۂ خوش گل کو میں
چومتا ہوں گرمجوشی سے ترے ساحل کو میں
جس طرح اپنے وطن پر جان کرتا ہوں نثار
میں تری خاکِ مشرف سے یونہی کرتا ہوں پیار

تو نہیں بھولی قلوبطرہ کی یادِ دلنشیں
نقشِ اندوزاب ہے جس سے ترا قلبِ حزیں
رُوح اس کی رقص کرتی ہے خلاؤں میں تری
گونجتی ہیں اُس کی آوازیں فضاؤں میں تری
ناز تھا تجھ کو زلیخا کی قبائے چاک پر
تو غرورآگیں تھی اُس کے جذبۂ بیباک پر
وہ بھی دن تھے تجھ پہ طاری ہیبتِ الہام تھی
نخوتِ فرعون جس سے لرزہ براندام تھی
دفن اخناتن ہے تیرے سینۂ خاموش میں
سو رہی ہے عظمتِ ماضی تری آغوش میں
تابشِ پیشانیٔ ہستی تری پارینہ ہے
زنگِ محکومی سے اب دُھندلا ترا آئینہ ہے
دل تڑپتا ہے مرا بیچارگی سے ناگزیر
دیکھتا ہوں جب کہ میں تجھ کو غلامی میں اسیر

آہ تو ہے آج ان کی چیرہ دستی سے نڈھال
آنکھ بھر کر دیکھنے کی بھی نہ تھی جن کو مجال
دیکھ تیرے آسماں کے ہیں ستارے منتظر
تیرے زندانِ جنوں کے ہیں کنارے منتظر
توڑ کر اک جوشِ حریت سے زنجیریں تمام
دے گرفتاروں کو تو آزاد ہونے کا پیام
اُن ہواؤں میں جو ہیں آوارۂ کشت و نخیل
سعدؔ[1] کی روح اس طرح کہتی ہے تجھ سے ارضِ نیل
تیرے ساونت اپنے میدانوں پہ چھا جانے کو ہیں
پرچمِ آزادی کے تیرے سر پہ لہرانے کو ہیں

(سوئیز۔ ۱۱ر اکتوبر ۳۰ء)

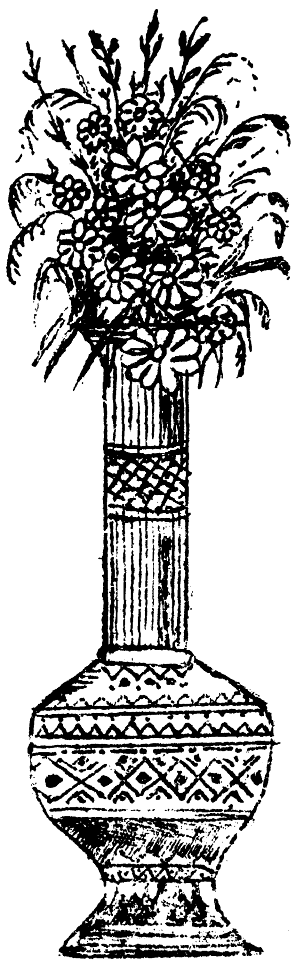
مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۹ر اپریل ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ "خیالستان" لاہور۔ (جون ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ روزنامۂ "زمیندار" لاہور (۳۰ر جولائی ۱۹۳۲ء)

[1] سعد زاغلول پاشا

سپاس



جیہول کا منظرِ جنگ

پھر خوئے جفا برسرِ پیکار ہوئی ہے
جیہول پہ جاپان کی یلغار ہوئی ہے

پھر مشرقِ اقصےٰ میں ہوس رانیِ جاپان
شیرازہ کشِ لشکرِ جرار ہوئی ہے

جو آن کی نظروں میں تھا اک یوزنۂ زردہ
گھات اس کی رگِ گرگ سے خونخوار ہوئی ہے

پھر نخوتِ تاجِ گہر افزائے "مکاڈو"
آمادۂ بدمستیٔ پندار ہوئی ہے

اس شوخ نے پھر کوسِ تتار اپنا بجایا
تجدیدِ بلاخیزیٔ رفتار ہوئی ہے

مظلوم کی ارزانیٔ خوں کے ہیں یہ ساماں
بیداد کی تلوار دل آزار ہوئی ہے
کہتا ہے یہ خندہ سے کہ تمدن کوئی طاقت
نہ ہو تو ضرور اس کی مددگار ہوئی ہے
شاطر کبھی یوں تو سبقت اقدام نہ ہوتی
سازش ہی کی شرکت سے وہ عیار ہوئی ہے
جو لہر بھی جاپان کے ساحل سے ہے آئی
تعمیر رکاب سپہ سالار ہوئی ہے
سرعت سے دھکیلا ہے ہنستوں کو کچھ ایسا
صف آرائی خط جنگ سے اس پار ہوئی ہے
جو مورچہ باندھا ہے انھوں نے وہ اکارت
جو روک بنائی ہے وہ مسمار ہوئی ہے
بھونے گئے دانوں کی طرح چین کے چیتے
یوں ریزش پروانۂ شرربار ہوئی ہے

گھر بار غریبوں کے ہیں شعلوں کی لپیٹیں

طیاروں سے گولوں کی وہ بوچھار ہوئی ہے

خرمن کی طرح راکھ ہوئے چین کے خیمے

کیا چشمکِ برقِ نگہِ یار ہوئی ہے

گھمسان کا ہنگامۂ خوں ریز ہے برپا

صدمات سے شق چین کی دیوار ہوئی ہے

ہر تار "ریوٹر" کا ہے اس بات کا مظہر

پی پیائی پہ پسپائی لگاتار ہوئی ہے

جس قوم پہ پہلے بھی بلائیں ہوئیں نازل

وہ تازہ مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے

جو مدت صد بارہ تھی آسودۂ صد خواب

وہ یورشِ دشمن سے خبردار ہوئی ہے

فریاد بلب قوم پریشان و ہراساں

انصاف کی دنیا سے طلبگار ہوئی ہے

جولانگہِ چینی ہے شرابور لہو میں
تہدیدِ "کفن دزد"[۱] بھی بیکار ہوئی ہے
پنہاں ہے اسی جنگ میں آزادیٔ مشرق
تمہید ابھی مائلِ اظہار ہوئی ہے
ظاہر میں تو ہے چین سے جاپان کی دراصل
سرمایہ و مزدور میں تکرار ہوئی ہے
یہ رزم ہمہ گیر کا ہے منظرِ اوّل
ہتھیاروں کی فی الحال تو جھنکار ہوئی ہے
بن جائیگی طوفاں یہ ہلکی سی شفق ہی
اقصائے اُفق پر جو نمودار ہوئی ہے
بارودِ خطرناک اچھل کر ہی رہیگا
جغرافیہ مشرق کا بدل کر ہی رہیگا

(یکم مارچ ۳۳ء) قلمکار (اوائل مارچ ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ جریدۂ "پیغام" لکھنؤ ۵ مارچ ۳۳ء	مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی ۱۳ مارچ ۳۳ء
مطبوعہ جریدۂ "وطن" لاہور ۱۷ مارچ ۳۳ء	روزنامہ "ویر بھارت" لاہور ۱۵ مارچ ۳۳ء

[۱] مجلسِ اقوام

جذبۂ ایثار

اگر کسی نے پریشاں ہی ہم کو کرنا تھا
تو رہگزارِ عرب کا غبار کر دیتا

یہ بار بار جفائیں سہی ہمیں جاتیں
کوئی خراب ہمیں ایک بار کر دیتا

یہ ایک جان تو کیا چیز ترے غم کی رہ میں
ہزار جانیں بھی ہوتیں نثار کر دیتا

مری فغاں سے نہ جب چنگاریاں نہ کیوں برسیں
فروغ جن کا مجھے بھی شرار کر دیتا

گلہ ان کے دلوں پر سے جب گذر جاتا
جہانِ سرد کو اک شعلہ زار کر دیتا

جو سو رہے ہیں ابھی مستِ خوابِ باطل میں

حقیقتوں سے میں اُن کو دو چار کر دیتا

مرے وطن کے جوانوں کو پھر نہ نیند آتی

جگا کے نیند سے یوں ہوشیار کر دیتا

سپر فگن ہیں جو، ہوتے وہ بڑھ کے سینہ سپر

ہے جاں سے پیار جنھیں جاں نثار کر دیتا

کچھ اس طرح میں تڑپتا، انھیں بھی اپنی طرح

شکشِ تپشِ اضطرار کر دیتا

بلندیوں پہ اگر اٹھ کے پھینکتا میں کمند

تو برقِ جیبِ فلک کو شکار کر دیتا

دراز دستِ حریفوں سے چھین کر قوت

میں زیردستوں کو با اختیار کر دیتا

(ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ اخبار "طاقت" دہلی (۵ اکتوبر ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "احرار" بمبئی (۸ اکتوبر ۳۲ء)

دعوتِ عمل

خطاب بہ حبیبِ وفا

بیا کہ سرکشیِ سرکشاں بگردانیم
بیا کہ بندگیِ بندگاں بگردانیم
درآ بہ جیش کہ فگنیم غلغلہ ز شرق
بیا کہ مرگِ جمودِ اماں بگردانیم
ہنوز خام دلی، لرزہ گیرد از ورزش
بیا کہ عافیتِ بزدلاں بگردانیم
شباب و شیبِ اثر خوردۂ حشیشِ فرنگ
بیا کہ فطرتِ پیر و جواں بگردانیم

مزاجِ آب و گلِ دہر مائلِ تخریب
بیا بیا کہ سرشتِ جہاں بگردانیم

فتادہ ایم بہ راہے کہ مے رسد بہ فنا
بیا کہ رہگذرِ کارواں بگردانیم

کہن پرستیٔ ہند ابتذالِ ذوقِ نیاز
بیا کہ نقشۂ ایں آستاں بگردانیم

حذر ز شیخ و برہمن کہ آں ہمہ کافر
بیا کہ کفر ز ہندوستاں بگردانیم

بہ سرفروشیٔ ارزانِ وفائے ما رسوا
بیا کہ صرفِ تسلیمِ جاں بگردانیم

متاعِ قافلۂ پا شکستہ در خطر است
بیا کہ رہزنیٔ رہزناں بگردانیم

ہزار انجمن اینجا میانِ آویزش
بیا کہ کشمکشِ این و آں بگردانیم

ز گنجِ عشق طلب ہائے عقل بے ہنرانہ
بیا کہ کاوشِ سود و زیاں بگردانیم

بیار بادۂ برافروز شامِ تیرہ و تار
بیا بیا غمِ ایں خاکداں بگردانیم

دیارِ ہند تُنک مایۂ و تُنک حاصل
بیا کہ کاہشِ بے مائیگاں بگردانیم

وطن ز ماتمِ تاراجِ برگ و بار تپید
بیا کہ حسرتِ آزردگاں بگردانیم

حدیثِ ماست سراپا غلامیٔ دگرے
بیا کہ سلسلۂ داستاں بگردانیم

ز اشتراکِ نگاہ و خیال و عزم و عمل
بیا کہ قسمتِ ہندوستاں بگردانیم

(۲۰ اگست ۳۳ء) قلمکار (۲۱ اگست ۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ سیاست لاہور (۱۲ ستمبر ۳۳ء) + مطبوعہ نظریۂ مہدی (دسمبر ۱۹۳۳ء)
مطبوعہ پمفلٹ "کافر آغا خاں" از مہدی حسن جبین پوری (جنوری ۱۹۳۴ء)

تا چند؟

یہ غم کی شبِ دراز تاکے؟
یہ تیرگیِ حیات تا چند؟
دل کی شنوائی ہو چکی آہ!
اظہارِ غمِ نجات تا چند؟
وعدے پہ جیئے جو دل تو کیونکر؟
تاویلِ تعینات تا چند؟
اب حوصلۂ شکیب کس کو؟
یہ مرحلۂ ثبات تا چند؟

جاں برلب انتظار ہے دل
محرومئ التفات تاچند؟

محرم ہے تو دلنواز ہو جا
مبہم سی تسلیات تاچند؟

رخ سے یہ نقاب اتار بھی دے
اخفائے تجلیات تاچند؟

ہونٹوں سے شگفتہ پھول برسا
انکار تبسمات تاچند؟

اے دوست! اب انقلاب فرما
اک رو پہ یہ دن یہ رات تاچند؟

معذور قرار و خود فراموش
آئین تغیرات تاچند؟

(۱۴ر ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ر ستمبر ۳۲ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ہندو جاتی

دشمنِ ہند جو ہے آہ تو ہندو جاتی
ہے جو اس دیس کی بدخواہ تو ہندو جاتی

خواہشِ آزادیِ مشرق کی ہے سب کو لیکن
جو نہیں جانتی یہ چاہ تو ہندو جاتی

ہند والوں کی رضا کاری و بربادی پر
کچھ بھی کرتی نہیں پرواہ تو ہندو جاتی

ہدیۂ خونِ محبانِ وطن کی قیمت
نہیں سمجھی جو پرِ کاہ تو ہندو جاتی

عبث الزام ہے ہمسایوں پہ گمراہی کا
فی الحقیقت ہے جو گمراہ تو ہندو جاتی

(۸ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۹ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ روزنامہ "ویر بھارت" لاہور (ستمبر ۱۹۳۲ء)

بسراوقات

مشفقانہ استفسار کا مؤدبانہ جواب

پُوں کہہ رہے ہیں آپ میری پرسشِ معاش
کس طرز پر تو یہ ہے بسر اوقات' بود و باش
بتلا رہی ہے وضع' سے ہے گذران کس طرح
لیکن جناب ہیں مرے پُرسان اس طرح
گویا کوئی ریا نہیں' سچے شفیق ہیں
اِس خود غرض زمانے میں مُخلص رفیق ہیں

اللہ اکبر آپ کو بھی ہے کسی کا دھیان
ہمدرد ہیں حضور بھی میرے، خدا کی شان!

جیبِ تہی سے فکر میں گو مبتلا ہوں میں
دشواریوں سے گرچہ بسر کر رہا ہوں میں
خاطر میں کاسہ لیسیٔ سرکار لاؤں کیوں؟
اپنے تئیں خود اپنی نظر سے گراؤں کیوں؟
بس ناصحانہ پند کی زحمت نہ کیجیے
اوروں کو جا کے مشورۂ کار دیجیے
میں تشنہ و گرسنہ رہونگا مگر کبھی
مجھ سے نہ ہو سکیگی خوشامد فرنگ کی

زر کو بنائیں شوق سے آپ اپنا دیوتا
سب دیوتاؤں کا ہے شہنشہ مرا خدا

(۲۷ فروری ۱۹۳۳ء)

مطبوعۂ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ اپریل ۱۹۳۳ء)
مطبوعۂ "جنرل نیوز" دہلی (۱۳ اگست ۱۹۳۳ء)

معاشرتی



بھکاری بچّے

ریزہ چینی کے لئے پیدا ہوئے ہم ہی غریب!
اور بھی قومیں تو بستی ہیں جہاں میں خوش نصیب
ان کا وہ پندار ہر منت کشی سے ان کو عار
اور ادھر برعکس یہ صورت ہر اک شے مستعار
کوئی سمت اپنی، نہ عزم اپنا، نہ اپنی شاہراہ
پستیِ ہستی میں ہے کھوئی ہوئی اپنی نگاہ

نقل سے غیروں کی ہے اپنی حقیقت بھی مجاز
کوئی چیز ایسی نہیں جس کو کہیں ہم خانہ ساز

نانِ شب کے واسطے دُنیا کے ہم محتاج ہیں
خستہ ہیں، پامال ہیں، برباد ہیں، تاراج ہیں!!

ہم مٹے جاتے ہیں جس پہ کیا بتائیں ہے وہ کیا
مغربی اطوار کا اِک خاکہ ہے اُترا ہوا

اپنی شمع زندگانی کیوں نہ تاریکِ یاس
ناگزیر اداروں سے ہو جب ہر کرن کا اقتباس

اُن کے بازاروں میں ارزاں سیم وزر کی ریل پیل
اور ہم یوں اقتصادی طور پر اُن کے دبیل

ان کی صبحیں نشرِ علم وفن سے صد فرحت بدوش
اُن کی خوش ہنگام شامیں کامیابِ ناؤ نوش

پُر طلسم اُن کے جمیل افسانوں کا رنگین باب
عشرتِ لہو ولعب سے دلفریب اُنکا شباب

لیکن ایسی لذتوں سے ہم تہی داماں ہیں آہ!
رائگاں ہیں، ناتواں ہیں، بے سروساماں ہیں آہ!

کچھ وسائل ہیں جو لے دیکھے تو وہ محدود ہیں
نہضتِ قومی کے سارے راستے مسدود ہیں

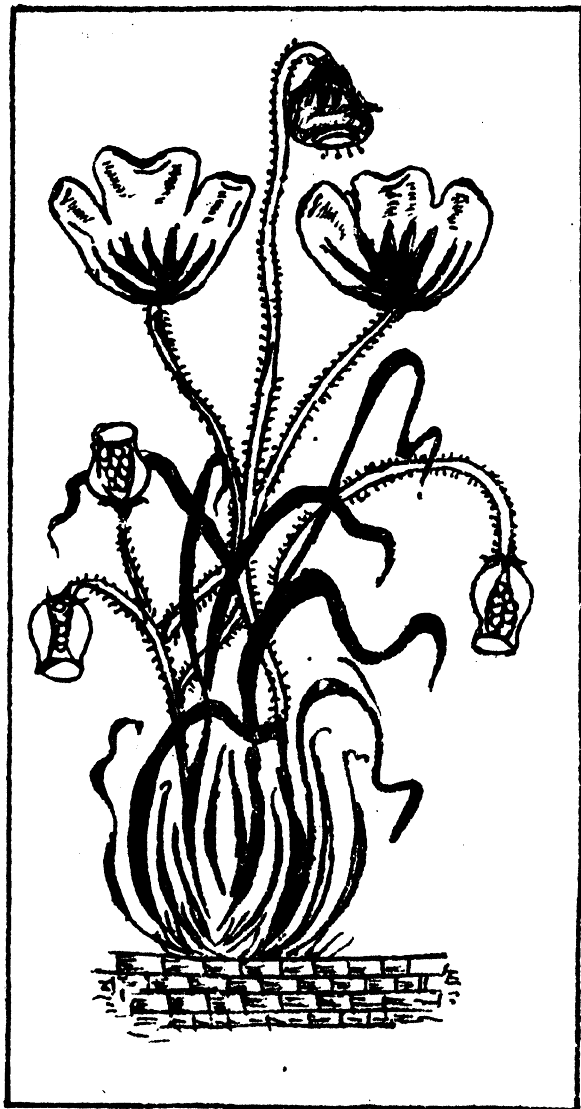
ملک میں ہے انتشار اور اس کا مرکز دلفگار
نیم کش ہیں جس میں لاکھوں تیر لاکھوں جگر کے پار

ٹھوکریں کھا کر بلٹتے ہیں جب اٹھتا ہے قدم
ایک بیکس اور بیچارہ قوم کے بچے ہیں ہم

مطبوعہ "پیغام" لکھنؤ۔ (۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "پیغام عالمگیر" لدھیانہ
(مارچ ۱۹۳۴ء)





اسلامی

ایک غریب الوطن کی التجا

ذیل کے ٹوٹے پھوٹے اشعار عدن کی پہاڑیوں پر طلوع ہونے والے چاند کو دیکھ کر اکتوبر [illegible] کی ایک جھلملاتی شام کی آغوش میں کہے گئے تھے۔ جس وقت میں عرشۂ جہاز کے جنگلے کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا اور میری آنکھیں ایک بہت ہی عجیب منظر سے متاثر ہو کر اشکبار تھیں، میں شروع کے تین شعر چاند کی کرنوں سے مخاطب ہو کر بلا ارادہ پڑھ رہا تھا کہ جہاز کو حرکت ہوئی اور عدن آہستہ آہستہ فاصلے کی اوٹ سے اوجھل ہو گیا، اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ میں کیبن میں واپس گیا اور میں نے پنسل سے کچھ سطور کاغذ کے کسی

ٹکڑے پر بطور یادداشت لکھیں، ——— لطیفی

اے دلنواز کرنو! میرا پیام لیکر

آوارۂ سفر کا پُر نم سلام لیکر

جو سجدہ گاہ سر ہے اس آستاں پہ جاؤ

اور سوگوار دل کی روداد کہہ سناؤ

اسلامیوں کے غم پہ آنسو بہا رہا ہوں

مشرق سے آرہا ہوں مغرب کو جا رہا ہوں

رُخصت! جہاز میرا لنگر اٹھا رہا ہے

ساحل سے ہٹ رہا ہے اور دُور جا رہا ہے

اسوقت تو چلا ہوں پوشیدہ راز ہوکر

آؤنگا پھر کبھی میں یکسر نیاز ہوکر

ایس۔ ایس وائسرائے آف انڈیا (جہاز)

(اکتوبر سنہ ۳۰ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۸ر اکتوبر ۳۲ء)

ہم کیا تھے!

(اسلامی زاویۂ نگاہ سے)

ہم دورِ کمسنی میں شیروں سے کھیلتے تھے
بیباک و جرأت آگیں تھی ہر ادا ہماری
جس کی جواں فضا کا ہر سانس جانفزا تھا
اُس گود میں ہوئی تھی نشو و نما ہماری
کون اُن دنوں ہمارے دم خم کی تاب لاتا
زور دل پہ تھی تواں مرد آزما ہماری

شوقِ قلمروِ نَو ہم کو اُبھارتا تھا!
رہ رہ کے گونجتی تھی بانگِ درا ہماری

حائل ہوئے جو رہ میں ریلے میں بہہ گئے سب
اِک سیلِ تند رو تھی رفتارِ پا ہماری

دیوارِ چیں سے لیکر کوہِ طلیطلہ[1] تک
گرمِ عمل تھی تیغِ کشور کُشا ہماری

معمورۂ زمیں کی سرکش بُلندیوں پر
بڑھ بڑھ کے چھا گئی تھی اُٹھتی گھٹا ہماری

(۱۹۲۹ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۱؍ستمبر ۱۹۳۲ء)
مطبوعۂ "جنرل نیوز" دہلی (؟)

[1] طلیطلہ کا کوہستانی سلسلہ اسپین کے سب سے بڑے دریا ٹیگس کے شمالی جانب واقع ہے، عربوں کے زمانہ سے پہلے اس پر گوتھک نسل کے مسیحی فرماں روا تھے،

الطرزِ نطیف

یا جہادِ حق پرستی کا بنا معیارِ نو
رسمِ جنگِ زرگری سے یا مجھے بیگانہ کر
یا نہ دے اس دل کو طوفانوں میں دادِ رستخیز
"ہرچہ بادا باد" کو یا شرطِ دیوانہ کر
یا کٹھن منزل میں بن جا میرے دل کا رہنما
یا خود اپنا خضرِ رہ یہ جذبۂ مستانہ کر
یا نوائے پرشکستہ کو گدازِ غم نہ دے
یا پرِ جبریل کو اس شمع کا پروانہ کر
یا عبودیت سے کر دے میرے سر کو بے نیاز
یا درِ اغیار پر مجھ کو جبیں فرسا نہ کر

یا مرے دل سے تو احساسِ وفا کو چھین لے

یا تلوّن زار میں اس جنس کو رسوا نہ کر

سلب کر لے یا رگ و ریشے سے خود داری مری

یا اس استغنا کو پابندِ مِنّت کشِ دنیا نہ کر

یا تُنک بخشی سے یوں پیمانۂ دل کو نہ چھیڑ

یا رہِ تسنیم و کوثر کو خطِ پیمانہ کر

یا بدل دے اس پریشاں خواب کو تعبیر سے

یا مری نیندوں میں اپنے خاص راز افشا نہ کر

یا پکار اُٹھ سعیِ لا حاصل ہے نا ممکن ہے یہ

یا اٹل تقدیر کو اک عزم کا افسانہ کر

میرا کیا ہے دوست! تیری ہی امانت ہے یہ دل

ذمہ دار اب تیری مرضی تو نظر کر یا نہ کر

(۷ رمئی ۱۹۳۳ء)

قلمکار (۹ رمئی ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ مساوات امرتسر (۱۵ رمئی ۱۹۳۳ء)

سپہ سالار سرنگا پٹم

"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را"

؟

ذیل کی نظم میں نے ۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو بوقت شام دہلی عربک کالج یونین کے ایک غیر معمولی اجلاس میں Whither Islam? (اِین اسلام؟) کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پین اسلامزم کے اِس سلسلے میں پڑھکر سنائی تھی جس میں سید جمال الدین افغانی کے علاوہ حضرت ٹیپو سلطان کے کارناموں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔

اے ہند کے سوادِ جنوبی کے رہ نورد
میسور کا فسانۂ خونیں نہ ہم سے پوچھ
گر پوچھنا ہی ہے تجھے دلسوز ماجرا
ویلور کے کھنڈر کی فغاہائے غم سے پوچھ
کیا شے ہے جو ادھر تجھے لائی کشاں کشاں
زائر یہ اپنے مرحلہ پیما قدم سے پوچھ
کس کی جدائی میں ہے ابھی تک وہ اشکبار
کاویریؔ زداں کی حزیں زیر و بم سے پوچھ
غدّار کس طرف تھا لٹیرے تھے کس کے ساتھ
یہ ولزلے کے تجزیۂ کیف و کم سے پوچھ
اتنی مصیبتیں پڑیں کیوں ایک جان پر
یہ چرخ فتنہ زا کی نگاہِ کرم سے پوچھ
ہے یاد اس کی کس قدر اندوہ درکنار
اندازِ بے نیازیٔ اہلِ حرم سے پوچھ

کس طرح کانپتے تھے لرزتے تھے مرہٹے
یہ شیر دل شہید کی تیغِ دو دم سے پوچھ
کہ اس کی شانِ اوج کا جبریل سے سوال
اس کا بلند مرتبہ لوح و قلم سے پوچھ
ثابت قدم رہا جو مخالف ہوا ابھی
پامردیِ مقاومت اس کے علم سے پوچھ
خود بن گیا کمان کا جو آخری خدنگ
عزم ستیز و معرکہ اس کی قسم سے پوچھ
برق اُن میں بیقرار ہے کس التہاب کی
یہ ذرہ ہائے خاک سرنگاپٹم سے پوچھ

(۱۸ر فروری ۳۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ر اپریل ۳۳ء)

مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (۳۰ر جون ۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ "سیاست" لاہور (۳ر ستمبر ۳۳ء)

مطبوعہ رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤ الدین (اکتوبر ۳۳ء)

مطبوعہ "تاریخ دولت خداداد میسور" از محمود بنگلوری ۳۴ء

اسلام کی آخری متاع

پر

پروفیسر بروس کا ناپاک حملہ

اسلامی تاریخ کو پنجاب یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کرنے کا اقدام

روزنامہ "انقلاب" لاہور کے پرچہ سے متاثر ہو کر

(قلم برداشتہ)

عبرت انگیز ہے یہ چرخ کا دورِ معکوس

درس آموز ہیں یہ لیل و نہارِ منحوس

جس کے ہر نعرۂ سطوت سے لرز جاتے تھے

کبھی ہسپانیہ، ایطالیہ، برطانیہ، روس

جس کی تہذیب و تمدن کا تھا ممنون جہاں

فیض یابانِ سر افراز تھے جس کے پابوس

آج یوں تیرہ نصیبی سے ہے مجبورِ نیاز

جیسے آہو ہو تہِ چنگِ پلنگِ سالوس

حیف اسلام کی تاریخ ہو متروکِ نصاب

اور پنجاب کے مسلم ہوں زباں بند افسوس

ہائے آبا کی وراثت کو مٹانے کے لیے

یوں ہو بیباک عدوئے خرد و ہوش پروس

وائے تقدیر کہ غفلت کی ہیں نیندیں طاری

اور خطرے میں ہیں اسلام کے ننگ و ناموس

کیا ہم اندلس کی تباہی کا سماں بھول گئے؟

موت بھی آئے تو ہوتی نہیں ہمکو محسوس!

تیری غیرت کو بھی کیا جوش نہیں آئے گا

دیکھ دنیا سے مٹے جاتے ہیں ربِّ قدوس!

(۱۲ جون ۳۲ء)

قلمکار (۱۲ جون ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۷ جون ۳۲ء)

حجازی قافلہ کا زخمی سپاہی

(رودِ فرات کے صحرائی پس منظر میں)

سپہر گوشِ برآواز کو یہ تازہ نوید
ضیائے ریزشِ خوں سے ستارہ زار ہے خاک
اب اس پہ رشک کرے تابشِ مہ و خورشید
اب اس سے ماند ہو تنویرِ انجمِ افلاک
نظر فروز ہے کس بانکپن سے آج شہید
فگار لب پہ تبسم، شگفتہ پیکرِ چاک

جلو میں اس کے رواں ہے نشاطِ فتح سعید
لہو میں رقص کیے جا رہا ہے وہ تیرِ اک
تڑپ ہے اس کے دلِ آتشیں کی قابلِ دید
شرارِ جستہ بھی ہے جس کے سامنے نمناک
شفق میں ڈوب رہا ہے ستارۂ ناہید
نہیں ہے خون میں غلطیدہ سرخرو بیباک
نقوشِ خوں سے ہے رنگیں نگارشِ جاوید
کہ رنگ پاشِ وفا ہے تراوشِ بیباک

(جنوری ۳۰ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۳ر مئی ۳۲ء)

مطبوعہ "المقالہ" سرگودھا (۱۲ر ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ روزنامہ "مساوات" امرتسر (۷ر مئی ۳۳ء)



معرکۂ حق و باطل

اب کھل کے رہے گی حق و باطل کی حقیقت
اک معرکہ ہونے کو ہے میدانِ عمل میں
اللہ کے بندوں سے ہے پھر برسرِ پیکار
وہ قوتِ طاغوت جو تھی لات و ہبل میں
قانونِ مکافات کہ اب تک ہے معطّل
گونجے گا وہ پنجاب کی ہر وادی و تل میں
تاریخ کو اک بار اُلٹنا ہے ورق پھر
ہنگامے بپا ہوں گے ہر اک دشت و جبل میں

کھول آنکھ کو اور دیکھ کہ اک فتنۂ محشر
پوشیدہ ہے آویزشِ اقوام و ملل میں
ٹکرائیں گے تکبیر کے نعرے جو فضا سے
اک زلزلہ پڑ جائے گا اقصائے زحل میں
آویزشِ خونیں سے ہیں خوف و خطر کیا
جب کود پڑے سر بکف اس جنگ و جدل میں
توپوں سے تفنگوں سے دبے ہیں نہ دبیں گے
بے باک بڑھے جائیں گے بارانِ اجل میں
کایا ہی پلٹ جائے گی دُنیا کی یکایک
نقشہ ہی زمانہ کا بدل جائے گا پل میں

(اوائل اگست ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ روزنامہ "زمیندار" لاہور (۱۹ر اگست ۳۲ء)



صبحِ نورافشاں

از سرِ نو کر دیا تاریکیٔ شب کو اسیر
صبحِ نور افشاں کی کرنوں کے سنہری دام نے
تازگی کی لہر لائی اک صدائے بازگشت
گردشِ معکوس کی وقتِ رواں کے جام نے
سرفروشانِ حرم ہنگامہ آرا ہو گئے
تازہ کی جھنکار پھر باطل شکن صمصام نے

نعرۂ تکبیر نے عالم میں ہلچل ڈال دی
حشر برپا کر دیا احرار کے اِقدام نے
دامنِ گیتی ہوا گلرنگ موجِ سُرخ سے
خون برسایا مسلسل تیغِ خون آشام نے
قصرِ استبداد کے دیوار و در تھرّا گئے
زلزلے پیدا کئے برق آفریں پیغام نے
گونجتی ہے یہ صدا معمورۂ آفاق میں
کر دیا زیر و زبر دُنیا کو پھر اسلام نے

(۱۹۲۹ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ "جنرل نیوز" دہلی (؟)



بھیگی ہوئی رات

یہ رُت، یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ بہاریں
یہ بستیوں کی نزہتیں، یہ رُکھ کی نکھاریں
اور دُور کے جھُولوں سے یہ سکھیوں کی ملاریں
اللہ رے برسات میں رعنائی دیہات!
یہ کہر کے گنڈولوں[۱] میں تاروں کا بہکنا
انگڑائی سے بہتی ہوئی کلیوں کا چٹکنا
تحلیل صباحت کا جمائی سے مہکنا!
کچھ اور بھی ہے جن سے حسیں بھیگی ہوئی رات!
چاک ابر کے جھالوں سے تجلّی سی عیاں ہے
کیا بادلہ مہتاب کا فانوس کتاں[۲] ہے
یا گیسوؤں میں شانۂ لمعات فشاں ہے
جس پھانس نے پھیلائے ہیں یہ کاکلِ برسات!

---

[۱] Gondolas
[۲] وہ لطیف کپڑا جو چاندنی سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے

گجرے ہیں یہ گردوں کے سمن فام ستارے
بجرے ہیں کسی برج کے جمنا کے کنارے
یا کھیتے ہوئے جاتے ہیں ملّاح شکارے
شبنم کا سمندر ہے نہیں بھیگی ہوئی رات!
بھیگی ہوئی بجری پہ ذرا گھومئے پیدل
نکھرے ہوئے بنگلوں میں ہے جنگل کا سا منگل
ہر حاشیۂ اکیر[۵۳] کا زمرّد کی ہے جدول
پڑتا ہے جہاں قمقموں کا پرتوِ لمعات!
کچھ نیند اڑی پھرتی ہے برکھا کی پلک سے
گاہے وہ لپٹ جائے ہے جھونکوں کی سنک سے
اور گاہے اچٹ جائے ہے شیشوں کی کھنک سے
کھیل آنکھ مچولی کی نہ ہوں کھیلتے رشحات!
رہ بھول کے آجائے جو رادھا کوئی پیاری،
مسکا ہوا "جمپر" ہو تو سرکی ہوئی ساری!
خود رفتگی موسم کی اس الھڑ پہ ہو طاری،
پرچھائیں میں گم جائے نہیں بھیگی ہوئی رات!

۱۹- جولائی ۱۹۳۷ء (مطبوعہ "نخلستان" ملتان)
(ماہ اگست ۱۹۳۷ء)

۵۳ نباتات کی ایک نوع جس کے کالم خوبصورتی سے تراشے جاتے ہیں +

خُون کے آنسو

موت کی تباہ کاریاں یُوں تو آغازِ تخلیق سے
تا آل پیری تک ہر دورِ زندگی میں دل خراش و جانگداز
ہوتی ہیں مگر شدید ترین المناکی کا نظارہ صرف اسی موقع
کیلئے مخصوص ہے جب کوئی شخص عین اُس منزلِ شاداب
تک پہنچکر جہاں سے شباب کی سرحد شروع ہوتی ہے۔
ایک بیجان لاش بنکر رہ جائے اور اُس کے کفن میں سینکڑوں
آرزوئیں لپٹی ہوئی ہوں ایسی ہی دردانگیز کیفیت کا
مظہر عزیزی محمد حسین عزیزی مرحوم (سابق متعلم انٹرمیڈیٹ

کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے حسرتناک انجام کا واقعہ ہے
جو ۲۲ اکتوبر بروز شنبہ ساڑھے نو بجے صبح کے یادگار لمحہ سے
ابتک بہت سے دلوں کو غم کی ضربوں سے پارہ پارہ کر
چکا ہے، ذیل کے اشعار راقم نے اسی دردناک اور پرملال
انتقال کی خبر سے متاثر ہو کر رقت وگداز کے عالم میں سپرد
قلم کیئے ہیں، یہ اشعار نہیں ایک مجروح وشکستہ دل کی آہیں
ہیں جو پردۂ ماتم میں ملفوف ہو کر سیاہ نقوش کی
صورت میں سیمائے قرطاس پر ابھر آئی ہیں،

برباد ماتم

(ل)

خون برسا دیدۂ خونتابہ بار
خشک منظر کو بنا دے لالہ زار
گل فشاں ہو گریۂ گل رنگ سے
تشنۂ تعبیر ہے خواب بہار

ہاں چھڑک افسردہ دِل خاک پر
اَے شہیدِ حسرتِ نقش و نگار
اَے جنوں کر آج دامن چاک چاک
اور اے وحشت گریباں "تار تار"
فرطِ غم سے ہے کلیجہ پاش پاش
شدّتِ اندوہ سے ہے دِل فگار
سانحہ ہے یہ کچھ ایسا دِل خراش
سنگ دِل بھی اس پہ ہیں ماتم گسار
"تازہ تھا الطاف کا ماتم ہنوز
تھی دلوں پر نقش اس کی یادگار
دردمند اُس کے تڑپتے تھے ابھی
تھا بدستور ان کا جوشِ اضطرار
مٹ گیا تھا یوں اُبھر کرنا گہاں
وہ شبابِ بحرِ ناپیدا کنار

اِک جھلک دِکھلا کے ہو جائے نہاں
جس طرح تاریکیٔ شب میں شرار
غارت اس معصوم کو کرنے کے بعد
موت کو آیا نہ کچھ صبر و قرار
ہائے اس برہم زنِ شیرازہ نے
چھین لی اِک اور جانِ مُستعار
آہ! کہتے تھے عزیزی ہم جسے
موت کو بھی تھا اسی ہستی سے پیار
باغِ گیتی کا وہ زود انجام گُل
اُٹھ گیا دُنیا سے اُپوسِ بہار
اُس کے ماتم میں ہے ہر برگِ چمن
گریۂ شبنم سے چشم اشکبار
نیم آوارہ سی تھی اُس کی شمیم
رنگ تھا اُس کا ابھی نیم آشکار

ہائے اُس کی وہ نمودِ ناتمام

جلوۂ تکمیل کا وہ انتظار

اوجِ رفعت پر چمکنا تھا اُسے

کیوں وہ جا سویا تہِ خاکِ مزار

چھپ گیا وہ اب نظر آتا نہیں

ڈھونڈتی ہیں اُس کو آنکھیں بار بار

رو رہی ہیں اب اُسے مایوسیاں

حسرتیں ہیں اُس کے غم میں سوگوار

کاش دے شورِ فغاں کا کچھ جواب

یہ ربطِ ہستی کا وہ خاموش تار

(اواخر اکتوبر ۲۸ء)

مطبوعہ در "علیگڈھ میگزین" علیگڈھ (نومبر و دسمبر ۲۸ء)



انتباہ

(۲۹ء کے مقامی سیاسیات کی یادگار)

اب "اہلِ ضبط" کو آزادیٔ عمل کا پیام
"نوائے زیر لبی" ہو بلند بر سرِ عام
اب آرہا ہوں میں صد محشرِ خروش بہ دوش
کہ ہے غضب کی "بلا خیز" میری "تیزیٔ گام"
اب اپنی خیر منائے "حریفِ زود شکست"
کہ انتظار میں اس کے ہے "عبرتِ انجام"
اب "اقتدار" کو اپنے وہ خیرباد کہے
کہ چند روز کی مہماں ہے اسکی قوتِ خام
"سرِ غرور" ہے اب عنقریب جھکنے کو
نہیں جہان میں مغرور کو ثبات و قیام

(۱۰ر نومبر ۱۹۲۹ء) قلمکار (۱۱ر نومبر ۱۹۲۹ء)

سہرا

[بتقریب شادی خانہ آبادی مسٹر محمد اقبال سعید بی اے فرزند
ارجمند شیخ مقبول احمد صاحب گورنمنٹ پنشنر لودیانہ]

گوندھکر لائی ہیں فردوس سے حوریں باہم
پیش کرنے کو بصد حسن و لطافت سہرا

بزم کی بزم ہوئی جاتی ہے مدہوش شمیم
آج برسائے ہے یوں نشۂ نگہت سہرا

طرفہ تزئیں سے ہیں آراستہ اقبال سعید
کیوں نہ ہو مظہر اقبال و سعادت سہرا

ان کی محفل کی ہے زیبائش و رونق ان سے
ان کے مکھڑے کی ہے آرائش و زینت سہرا

آشکاراں کے نصیبے کی ہے اس طرح نوشت
لوح قسمت ہے جبیں، خوبیٔ قسمت سہرا

منفعل جس سے ہو شادابئ عالم کا نکھار

اپنے پھولوں میں لئے ہے وہ طراوت سہرا

رنگ پھیکے ہوں سبھی جس کی پھبن کے آگے

آج رکھتا ہے اُسی شان کی رنگت سہرا

دُرِ خوش آب بھی دلکش ہو تو شرما جائے

ایسے رشتے سے ہے وابستۂ نسبت سہرا

دیکھئے بارِ نظر ہی سے جھکا جاتا ہے

اللہ اللہ ہے یہ جانِ نزاکت سہرا

رُخِ نوشہ سے ٹپکتے ہیں حیا کے قطرے

یا تأثر سے ہے نمناکِ مسرت سہرا

حدِ دامن کے ادب پر ہے یہ مجبور مگر

اور بڑھ جانے کو مانگے ہے اجازت سہرا

جتنے پھرے ہیں تر و تازہ نظر آتے ہیں

جملہ حضرات کو ہے باعثِ فرحت سہرا

(۴ر اکتوبر ۳۲ء) قلمکار (۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)

فریاد

بدرگاہِ ربِ قہار

خوگرِ دُشنام ہے جن کا یہیں الحاد سے
اے خدا! ہم کب تک اُن کی گالیاں سُنتے رہیں؟
آہ! سہتے جائیں کب تک جملہائے نابکار
آہ! کب تک ہرزہ ہائے بدزباں سُنتے رہیں؟
کیا نئی تہذیب کے کالج بنے ہیں اس لئے
کفر و باطل ہی کے لکچر نوجواں سُنتے رہیں؟
پودِ نو کے نزد ہے یہ معنیٔ ترکِ رسوم
بس رسولؐ و رب کی نافرمانیاں سُنتے رہیں؟
منہہ پھٹ اور گستاخ لب ہیں یہ بتانِ خیرہ چشم
تا کُجا اِن کی ہزل گفتاریاں سُنتے رہیں؟

وہ علی الاعلان کہتے ہیں :- "خدا کچھ بھی نہیں"[1] !

کب تک اک انہونی شے کی داستاں سُنتے رہیں!

اور اگر ہے بھی تو پھر ظالم بہ خم ہے بدمعاش

کیوں نہ انساں اُس کی بدکرداریاں سنتے رہیں!

تا بکے برداشت اُس کے "مسخراپن" کو کریں

تا کجا ہم اشتباہِ امتحاں سُنتے رہیں؟

کب تک اس کے غمزہ ہائے بے محابا کو سہیں

تا کجا افسانۂ گردِ بیاں سُنتے رہیں!

حُرمتِ اسلام سے بہتر ہے اک پائپ کا کش

کیوں تری پند اے حرم کے پاسباں سُنتے رہیں!

.. ..

.. .. کیا

---

[1] نقل کفر کفر نباشد

اے خدا! کب تک ترے بندے یہ استہزاء و طنز
مُہر بر لب، صُورتِ بیگانگاں سُنتے رہیں؟
تا کجا یہ قہقہہ ہائے خباثت سُنتے جائیں؟
آہ! کب تک گفتگوئے بے عناں سنتے رہیں؟
تُو نے بخشی ہے انہی کو اپنی قوت جو یہ آس
ہم سے رکھتے ہیں کہ تجھ پر پھبتیاں سُنتے رہیں!
کاش دے ہم ناتوانوں کو بھی کچھ تاب و تواں
کیوں تری تحقیرِ شاں ہم ناتواں سُنتے رہیں؟
کیا یہ سب دشنام سرمہ در گلو سُنتے ہی جائیں
کیا تری توہین سیسہ در دہاں سُنتے رہیں؟
گوشِ شنوا سے تو یا تابِ شنیدن چھین لے
یا بتا کس طرح تشنیعِ بُتاں سُنتے رہیں؟

کیا خبر کس وقت آئیگا تری غیرت میں جوش
تا کجا یہ طعنہ ہائے جانستاں سُنتے رہیں؟
دیکھتے جائیں علیگڈھ میں نئی آزادیاں
دیوبند اور ندوہ میں پابندیاں سُنتے رہیں؟
ہو غلو اِک دوسرے کیواسطے وجہِ جواز
اور ترکِ اعتدالِ این و آں سُنتے رہیں؟
کیا مقدر میں ہمارے ہے یہی ہم تا ابد
وعدہ ہائے انقلابِ آسماں سُنتے رہیں؟
سُنتے سُنتے پک چلے ہیں سُننے والوں کے بھی کان
سُن! ہماری بھی کہ کب تک رائیگاں سُنتے ہیں؟
پھٹ پڑے ان ملحدوں پر آسمانِ قہرمان
اور ابد تک ان کی ہم آہ و فغاں سُننے رہیں؟

(مطبوعہ "سیاست" لاہور) (۲۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء)

سہرا

[بتقریب شادی خانہ آبادی مسٹر محمود علی عارف
بی۔اے فرزند ارجمند بابو نعمت علی صاحب لدیانہ]

بانکپن حسنِ جواہر کا ہو صدقے جس پر
اپنی سج دھج میں لئے ہے وہ سجاوٹ سہرا
عارضِ نوشہ کو گھیرے ہوئے ہے جن کا ہجوم
ایسے گلہائے معطر کا ہے جھرمٹ سہرا
اپنی قسمت پہ یہ پھولے نہ سمائے محمود
کہیں سن لے جو تیرے نام کی آہٹ سہرا
تیری پیشانی کی لیتی ہیں بلائیں کلیاں
تیرے رخسار سے کرتا ہے لگاوٹ سہرا
منہ چھپا کر یہ لجانا نہیں اس دم زیبا
کوئی محفل سے نہ کہدے کہ ہے گھونگھٹ سہرا

کثرتِ شوق سے نظریں ہی اُلجھ جاتی ہیں
ورنہ ہے راہ میں ہلکی سی رکاوٹ سہرا

کسی معصوم سی شوخی سے اگر موجِ نسیم
چھیڑنے آئے تو کہتا ہے "پرے ہٹ" سہرا

دیکھئے پیار سے دولھے نے اُسے تھام لیا
مڑ کے جب لینے لگا لہر کی کروٹ سہرا

دل پہ ڈورے سے ہیں ڈالے ہوئے نوساختہ ہار
ایسی رکھتا ہے دل آویز بناوٹ سہرا

یوں پروئے ہیں کسی نے نئی کلیوں کے یہ تار
نظر آتی ہے خود اپنی جگہ ہر لٹ سہرا

شوق کی پیاس کچھ اس طرح بجھاتی ہے برات
شاد نظریں تو ہیں پنہاریاں، پنگھٹ سہرا

ان کو اس وقت پہ ملنے کا تھا ارمان بہت
دیکھتا ہے جو عزیزوں کا یہ جمگھٹ سہرا

(۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

قطعہ

[ذیل کا "ہدیۂ تہنیت" مسٹر محمد نذیر حسین فرزند ارجمند حاجی قطب الدین صاحب نے مسٹر محمود علی عارف فرزند ارجمند بابو نعمت علی صاحب رضا کی شادی خانہ آبادی کی تقریب پر مجھ سے لکھوا کر نفیس کاغذ پر پیش کیا تھا (ل)]

تو چمکتی ہوئی آنکھوں کا ہے تارا محمود
تیری شادی سے ہی دل شاد ہمارا محمود
ساری محفل کو ترا جلوہ ہے پیارا محمود
آج اس طرح ہے تو انجمن آرا محمود

(۵ / اکتوبر ۱۹۳۲ء) قلمکار (۶ / اکتوبر ۱۹۳۲ء)
مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" (۲۸ / اکتوبر ۱۹۳۲ء)

نالۂ شمع

سوزِ فرقت سے جلاتا ہے گدازِ غم مجھے

ماتمی ہوں میں، تپش آموز ہے ماتم مجھے

سوختہ سامانیٔ حسرت ہے اب ہمدم مجھے

داغِ حرماں دے چکی ہے صحبتِ برہم مجھے!

(اوائل سنہ ۳۶ء) (غیر مطبوعہ)

قیدی

قیدی تڑپ تڑپ کر آزاد ہو نہ جائیں
ڈالے ہوئے ہیں ہم پر اُن ظالموں نے پھندے
اُن کی ادا ادا سے نفرت برس رہی ہے
تیور ہیں اُن کے میلے انداز اُن کے گندے
ڈنڈوں نے بیکسوں کی کھالیں اُدھیڑ دی ہیں
اِن چیرہ دستیوں سے شرما گئے ہیں رندے
آفت جو کوئی ڈھا دی ہم نے انھیں دعا دی
وہ ہیں جفا کے عادی ہم ہیں وفا کے بندے
فاقوں کے ظلم اُٹھائے مر مر کے بھی نہ پائے
انڈے، کباب، چائے، بالائی اور پسندے
لاوارثوں کی لاشیں یوں ہی پڑی رہیں گی
آئیں کفن کہاں سے ملتے نہیں ہیں چندے

(جولائی ۱۹۳۰ء)

(غیر مطبوعہ)

فتنۂ مرزائیہ

قادیاں بقعۂ انوار ہے چشم بددور
عارض ولب ہیں وہاں ماہ وشوں کے گلگوں
نازنینوں کی اداؤں کا ہے کیا خوب نچوڑ
"مشی فی النوم" کا کیف آور ورنگیں مضموں
موسیو اپنے سمجھ کے ہیں "حسن بن صبّاح"
کیوں نہ پریوں میں گذاریں وہ شب عیش فزوں
لیکن ان سے وہی تنبیہ طلب کرتے ہیں
جن پہ چل جائے خوش آیند ریا کا افسوں
ایک تصویر مسلسل جو "سِول" نے چھاپی
کیوں پسند آئی تھی وہ اتنی یہ میں بھی تو سنوں
کیا اسی واسطے لندن وہ نمائندہ گیا
کہ طرفداریٔ دجّال کا چھانٹے قانوں
"یونین جیک" اڑے گنبدِ خضرا پہ بھی

یہ ہے سرکاریِ نبوّت کی تمنّائے زبوں
باز آیا نہ شر افزائی سے شر کا بانی
شوخ چشمی میں تھا حد سے متجاوز ملعوں
ایک بھی مُردہ مراقی سے جلایا نہ گیا
راز کیوں جعلِ مسیحائی کا افشا نہ کروں
سُکرِ ہذیانِ دماغ اس پہ جو مستولی تھا
اُس کے بیٹے پہ بھی طاری ہو رہی طُرفہ جنوں
اُس کے نزدیک بھی ہے نسخۂ اکسیرِ مسیح
وہی آمیزشِ تادیل و گماں کا معجوں
اُس کی منطق کے جراثیم نے پھیلائی ہے
سادہ لوحوں کے رگ و ریشہ میں مُہلک طاعوں
وائے تاراج ہوئی سیزدہ صد سالہ متاع
ناگہاں گھات سے مارا ہے کچھ ایسا شبخوں
کیا تعجب ہے کہ اس شعبدہ بازی پہ بھی اولہ

جدّتِ شعبدہ دکھلائے یہ دورِ گردوں
شاہِ بابل[1] نے جو رو یائی سماں میں دیکھے
ذہب و سیم و برنج ایک جسد میں موزوں
وہ عناصر ہیں ابھی دہر میں موجودِ ہوس
اور اُس بُت کے پرستار ہیں اس پر مفتوں
چوٹ کھا کر اُسے گرنا ہے ابھی اوندھے مُنہ
سنگ بطحا ہے پسِ پردۂ غیبی مکنوں
کیوں کوئی زر زدہ تسلیم ہو سرمایۂ شکن
اُس سے جب زر شکنی کا ہو ذرا بھی نہ شگوں
لعنتِ زر کو زمانے سے جو دھو ڈالے گا
پاک ہوگا اسی مہدی سے یہ معمورۂ دوں
جب نمودار وہ ہوگا درِ ارضِ قُدس سے
پھوٹ نکلیں گے وہیں بادۂ عرفاں کے عیوں

(۷ مارچ ۱۹۳۳ء) قلمکار (۹ مارچ ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ "زمیندار" لاہور (۱۴ مارچ ۱۹۳۳ء)

[1] بخت نصر (بارھویں صدی قبل مسیح)
Nebuchadrezzar

گل کے ترشے ہوئے بُت

[ارکان ادارۂ روزنامہ "آزاد" لاہور
پر ایک مزاحیہ پارۂ نظم]

جو دبستانِ صحافت میں ہیں طفلِ مکتب
ملکِ بدبخت کے وہ راہنما بنتے ہیں
کمسنی میں نہ جنھیں ہوش تھا دل لینے کا
وہ ستمِ غمزوں سے اب ہوشربا بنتے ہیں
انکسار آنکھ میں اپنی جو لئے رہتے تھے
کوئی دیکھے کہ وہ پندار سے کیا بنتے ہیں

خواجہ بننے کی خلش خواہ اُنھیں خوار کرے
وہ مگر ٹھاٹھ سے اب خواجہ سرا بنتے ہیں
زُعم سے بانس پہ چڑھ چڑھ کے تھرکنے والے
ڈارون ایسے بزرگوں کے چچا بنتے ہیں
مہربانو! اُنھیں جی بھر کے بنائے جاؤ
وہ حسینوں سے بھی کچھ آج سوا بنتے ہیں
کیوں نہ کہرام ہو چکلوں کے شبستانوں میں
اپنی لپشواز سے وہ آج خُدا بنتے ہیں!

(۱۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء) قلمکار (۱۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء)



جگن ناتھ تھاپر

عریاں تو کیجیے مگر اتنا نہ کیجیے
ناسور اپنے ننگ کا ننگا نہ کیجیے

جو آریہ سماج کے پردے میں ہے نہاں
اُس رازِ سر بمہر کو افشا نہ کیجیے

آئینہ سے یہ داغ دھلیگا نہ پھر کبھی
آئینہ تابِ حُسنِ خود آرا نہ کیجیے

مستُور رہنے دیجیے سینے میں یہ عناد
اِس کینے کے دفینے کو رسوا نہ کیجیے

یہ چیرہ دستیاں ہیں ابھی سے جناب کی
بس چل سکے جو آپ کا کیا کیا نہ کیجیے

حاکم ہیں آپ محکمۂ ڈاک کے ضرور
اس حاکمی سے ہم کو ڈرایا نہ کیجیے

پتلی سی اس کمر سے یہ خنجر نہ باندھئے
سامان یوں ہنسی کا مہیا نہ کیجیے

زخمی بہت ہیں پہلے ہی نخچیر آپ کے
چرکے اب اور دل پہ لگایا نہ کیجیے

آپ اپنی کوششوں سے ہیں تو ڈاک چکے
زحمت یہ مستزاد اٹھایا نہ کیجیے

بد قسمتی سے ہو گئے پیدا جو ہند میں
اس زندگی کو اور غم افزا نہ کیجیے

یا طول دیجئے نہ غلامی کو اس طرح
یا ہم سے پھر شکایت بیجا نہ کیجیے

اس آئے دن کی حق تلفی سے ملا پڑیں
اب ہندوؤں پہ کچھ بھی بھروسا نہ کیجیے

دیکھیں اگر وہ لطف و کرم کی نظر سے بھی
احسانِ التفات گوارا نہ کیجیے

وہ لاکھ مہرباں ہوں ہمسایوں پر مگر
بھولے سے بھی یقینِ مدارا نہ کیجیے

تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ ٹھہری ہیں سازشیں
یوں آستیں میں دشنہ چھپایا نہ کیجیے

لکھتا ہے میرا خامہ بھی غم روشنائی کا
خنجر مرے لہو میں بجھایا نہ کیجیے

یہ وہ بلائے جاں ہے کہ کھنچ جائیں گے خود
مجبور اس قلم کو خدارا نہ کیجیے

(۴ ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۹ ستمبر ۳۲ء)

حاکم ہیں آپ محکمۂ ڈاک کے ضرور
اس حاکمی سے ہم کو ڈرایا نہ کیجیے

پتلی سی اس کمر سے یہ خنجر نہ باندھیے
سامان کیوں ہنسی کا مہیا نہ کیجیے

زخمی بہت ہیں پہلے ہی نخچیر آپ کے
چرکے اب اور دل پہ لگایا نہ کیجیے

آپ اپنی کوششوں سے ہیں تو مٹا چکے
زحمت یہ مستزاد اٹھایا نہ کیجیے

بدقسمتی سے ہو گئے پیدا جو ہند میں
اس زندگی کو اور غم افزا نہ کیجیے

یا طول دیجیے نہ غلامی کو اس طرح
یا ہم سے پھر شکایت بیجا نہ کیجیے

اس آئے دن کی حق تلفی سے ملا یہ درس
اب ہند و دکن پہ کچھ بھی بھروسا نہ کیجیے

دیکھیں اگر وہ لطف و کرم کی نظر سے بھی
احسانِ التفات گوارا نہ کیجیے

وہ لاکھ مہرباں ہوں ہمسایوں پر مگر
بھولے سے بھی یقینِ مدارا نہ کیجیے

تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ گہری ہیں سازشیں
یوں آستیں میں دشنہ چھپایا نہ کیجیے

رکھتا ہے میرا خامہ بھی غم روشنائی کا
خنجر مرے لہو میں ڈبایا نہ کیجیے

یہ وہ بلائے جاں ہے کہ پچھتائینگے حضور
مجبور اس قلم کو خدا را نہ کیجیے

(۴ ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۹ ستمبر ۳۲ء)

یُوں ڈنڈ نہ پھیلا کر

اک پردہ نشیں ہے تُو
جو کچھ ہے وہیں ہے تُو

مُردوں میں نہ کھیلا کر

کتنی تری قیمت ہے
کیا تیری حقیقت ہے
یہ ہم کو نہ کہنے دے
پردے ہی میں رہنے دے

اے سالکِ اقبالی!

(۱۷ جولائی سنہ [illegible]) قلمکار (۱۷ جولائی سنہ [illegible])



کانگرس کی ارتھی

کو

کندھا دینے والے کہاروں کی بپتا

(سیاسی مسخروں کا دم واپسیں)

(مقامی سیاسیات)

نظر آتی ہے جن کو کانگرس میں کچھ رمق ابتک
وہ اس کی موت کا سامان تازہ دیکھتے جائیں

جو روئیں گے سیہ کاروں کے ہونے والے ماتم پر
وہ آئینوں میں تاریخی کا غازہ دیکھتے جائیں

کفن کا بانکپن جس "لیڈری" کو راس آئے گا
ابھی اٹھنے کو ہے اس کا جنازہ دیکھتے جائیں

(۱۰ اپریل سنہ [illegible]) قلمکار (۱۱ اپریل سنہ [illegible])



انجامیہ

نقشِ لوح

این اشعار برائے لوحِ مزار اہلیہ محترمہ پروفیسر عبدالعزیز ایم اے داماد خانصاحب ڈاکٹر نور محمد صاحب ایل - ایم ایس بتاریخ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۳ء بوقت صبح گفته شد

لطیفی

چوں قضا آورد ہوائے انقلاب

دور گردد ہمرکاب اندر رکاب

[illegible] خلیجِ گریہ محرومِ لدفو

صد جہانِ حسرت ایں اخگر در آب

گفت بر پایانِ ہستی غمگسار

شد فرو محمودهٔ سلطان زیر آب

۱۳۵۲ھ

(غیر مطبوعہ)

انجام کسی کا

اک چاکِ گریباں		رُسوائی بہ داماں
جینے سے پشیماں
دیکھا کبھی یوں بھی		آغازِ محبت؟

گردن کو جھکائے		اور موت بلائے
مقتل میں در آئے
دیکھا کبھی یوں بھی		اعجازِ محبت؟

قاتل کے ارادے یہ کہہ کے جگا دے
اب دادِ وفا دے
دیکھا کبھی یُوں بھی اندازِ محبّت؟

خوں گشتہ و بسمل مٹ جانے کے قایل
مٹ جائے کوئی دل
دیکھا کبھی یُوں بھی اعزازِ محبت؟

گردِ رہِ اُلفت رعنائی کی تُربت
اللہ رے قسمت
دیکھا کبھی یُوں بھی جانبازِ محبت؟

(۳۰ اپریل ۱۹۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۶ مئی ۳۲ء)
مطبوعہ جریدہ "المقالہ" سرگودھا (۵ ستمبر ۳۲ء)

دُعائے شام

آثار کہہ رہے ہیں شبِ غم قریب ہے
معصوم کمسنوں کے خدا! میرا ساتھ دے

رات آرہی ہے سر پہ یہ منظر مہیب ہے
تنہا ہوں، کانپتا ہے دل، آ میرا ساتھ دے

مایوس ہو چکوں میں جب آرزوں کی یاد سے
بھولے نہ بینوائی میں میرا خیال تُو

چھن جائے عیش جب دلِ مسرور وشاد سے
شامل ہو میرے حال میں اے لازوال تُو

(اوائل نومبر ۱۹۲۹ء)

مطبوعہ جریدہ "اصلاح" لدھیانہ (۱۰ نومبر ۱۹۲۹ء)

Abide With Me!

"Abide with me fast falls
the eventide,

The darkness deepens
Lord with me abide,

When other helpers fail
and comforts flee,

Oh, Thou who changest not
abide with me."

(?)
(translation on preceding page)

ایک بوالہوس کی بیزاری

(پرستیدۂ ہوس کی رعنائیوں کو مضمحل دیکھکر)

گلہ فضول ہے میری کم التفاتی کا
میں کیا کروں کہ وہ دلچسپیاں نہیں تم میں
نہ مسکراؤ نہ پژمردہ پھول برساؤ
وہ دن گئے کہ کشش تھی لبِ تبسم میں
ہوئے بھی نشۂ طلب گردشِ شراب کے بعد
کہاں سے آئیگی مستی ہوئے خم میں

گئیں شباب کی باتیں شباب کے ہمراہ
رہا نہ لطفِ سخن صحبتِ تکلّم میں

اب اک سکوں اُسی دُنیائے دل پہ چھایا ہے
جو ولولوں کی کشاکش سے تھی تلاطم میں

بہارِ عشرتِ ماضی کا نغمہ رہنے دو
اب اعتبارِ مسرّت نہیں ترنّم میں

اُداس ہیں یہ تمہاری نمائشیں ساری
وہ رنگ و بُو نہیں جلووں کے اِس تراکم میں

(سنہ [illegible])

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۲۲ ستمبر ۳۲ء)

مطبوعہ جنرل نیوز۔ دہلی (۲۶ اکتوبر ۳۲ء)



حسرتِ واپسیں

بیزار نگاہی ہے ہمرنگِ خلش کاری
غم خوردۂ ناوک کی اللہ رے سزاواری

معصوم سے لہجے میں کہتے ہیں خدا جانے
کس تیر کی فریادی ہے اس کی دل آزاری

اڑتی سی خبر ہے یہ گھائل ہے رگِ جاں بھی
لب چاک ہیں اور اُن سے کچھ خون بھی ہے جاری

اُن سے یہ ذرا کہہ دو منہ دیکھ لو اب اُس کا
مہماں ہے کوئی دم کا بربادِ وفاداری

کیفیّتِ نبض اب تو کچھ اور بھی نازک ہے

مٹنے کو ہے دنیا سے پامالِ ستمگاری

باز آؤ، چلے آؤ، پچھتاؤ گے پھر ورنہ

جاتی ہے کوئی ساعت، بجھ جائیگی چنگاری

آکر سرِ بالیں تک آسان سفر کردو

غربت کی ہے طیاری منزل ہے بڑی بھاری

ناساز سے ہمدردی ہے ریت زمانے کی

دستور ہے دنیا کا بیمار کی غمخواری

مر مٹنے کے بعد آخر پہنچے بھی جنازے پر

کچھ کام نہ آئے گی پھر رسمِ عزاداری

ڈھونڈے سے بھی دنیا کے پردے پہ نہ پاؤ گے

"یہ شیوۂ جانبازی یہ ذوقِ فداکاری"

(۱۰ر جنوری ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ "تازہ دستہ" لدھیانہ (۴ر اپریل ۱۹۳۳ء)

شیلے کی یادگار

ذیل کے اشعار اس وقت سپردِ قلم کیے گئے تھے جب میں ۱۱ اگست ۳۱ء کی ایک نہ بھولنے والی شام کو تھکان سے چور روما (اطالیہ) کے "پروٹسٹنٹ" گورستان میں انگلستان کے مایۂ ناز شاعر شیلے کا مدفنِ دل دیکھنے کے بعد اپنی جائے قیام "البرگو پالتزو"[۱] پر پیدل واپس آیا تھا، شیلے کی موت بھی اس کی زندگی کی طرح شاعرانہ تھی، سمندر میں ڈوب جانے کے بعد اس کے جسم کو باہر نکال کر ساحل کے قریب ہی دفن کر دیا گیا تھا، مگر جسم مدفون روما میں منتقل کرنے کے موقع پر جب اُس زمانے کے آئین کے مطابق نذرِ آتش کیا گیا تو باقی تمام اعضا کے جل جانے کے باوجود دل کو کوئی ضرر نہ پہنچ سکا، اُسی غیر فانی دل کی یادگار اِن اشعار کا موضوع ہے، — — — — — — —

[۱] Albergo Palazzo

وہ جوانمرگ ایک ایسے کُنج کا دلدادہ ہے

اُس کی رنگیں داستاں کے سامنے جو سادہ ہے

شمع جلتی ہے کوئی تربت پر اُس کی یا نہیں

سوختہ پیکر کو سطحی سوز کی پروا نہیں

کس تڑپ کا شعلہ غلطاں تھا دلِ بیباک میں

ایک برقی مس کی لہر اب تک ہے نبضِ خاک میں

نشترِ مغرب سے نوائیں اس کی پارہ پارہ ہیں

شام کے بے چین جلووں کی طرح آوارہ ہیں

التہاب آموز حسن ابھرا ہے روپوشی میں بھی

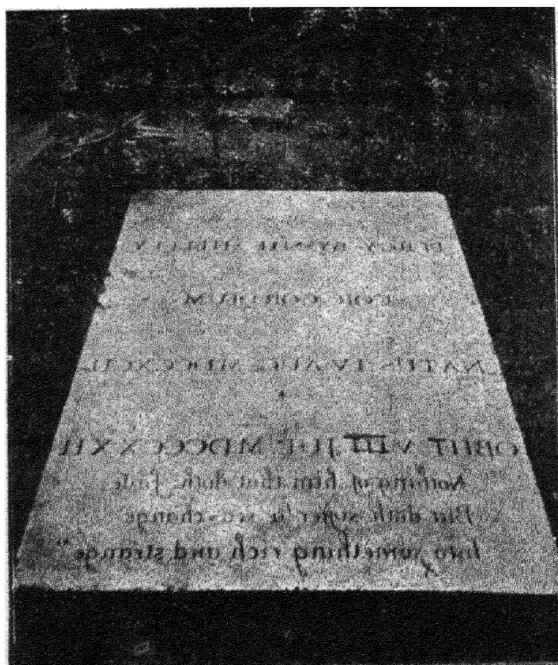
اُس کی چنگاری تپش پرور ہے خاموشی میں بھی

(۱۱ر اگست ۳۲ء) ۔مطبوعہ رسالہ "راوی" لاہور (مارچ و اپریل ۳۲ء)

مطبوعہ جریدہ "مطالعہ" لدھیانہ (۸ر جولائی ۳۲ء)

شیلی کی نظم ode to the west wind کے آخری ٹکڑے میں

جو پیشین گوئی کی گئی اُس کے صحیح ثابت ہو جانے کا اعتراف ہے +


OBIIT VIII JUL MDCCCXXII
Into something rich and strange

کیفیّتِ یاد

(سانیٹ[1])

جس طرح ملفوف ہو شیرازۂ قرطاس میں
برگِ گُل یا موسمِ گُل کا وداعی ارمغاں
ویسے ہی آسُودہ ہو پہنائی احساس میں
ایک بیتی یاد کی یعنی محبّت کا نشاں!

دِلکش و رنگیں دھنک کے لمسِ افسوں ساز سے
جیسے رنگ اندوز ہو محرابِ سیمینِ سحاب
رُوح پر ہو غیرِ فانی نقش اُسی انداز سے
چھائے اور ڈھل جائے جب خوابِ نگارینِ شباب!

---

[1] Sonnet

شاخِ عنبر[1] جس طرح تارِ رگِ گلدستہ ہو
اور دُودِ منتشر سے عنبریں ہو موجِ باد
تارِ یادِ اُلفت کے پھولوں سے یُونہی پیوستہ ہو
اور چھَن چھَن کر لطیف افسانہ سے مہکائے یاد!

قلم ہو تفریح پرتو سے فشارِ سرگذشت
خوابگوں نیرنگیوں سے جھلملائے بازگشت!

(۲۵؍ اگست ۱۹۳۳ء)

قلمکار (۱۱؍ دسمبر ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ سالنامہ "نیرنگِ خیال" لاہور (۱۹۳۴ء)

---

[1] "اگربتی"

پنکھڑیاں

اے دلِ پُرسوختہ پتنگے! کس آرزو کا غبار ہے تُو
مثالِ شمعِ مزار، تربت نشینِ شمعِ مزار ہے تُو!

اِک لحظہ کیا بیخود ہوا صدیوں ہی پیچھے جا پڑا
مُڑ کر غبارِ کارواں دیکھا تو کوسوں دُور تھا!

ہوک بن گئیں ٹیسیں جب چلا نہ کچھ بھی بس
دِل مسوس کر اپنا رہ گیا کوئی بیکس!

کیوں ارے ناداں! کیا گھاتوں سے وارستہ ہے تیری بات
تُو نے جفا کی، ہم نے سہہ لی، کٹ گئیں گھڑیاں، رہ گئی بات

وہ شب و روز نوازش نہ رہی
نہ رہی لطف کی بارش نہ رہی!

اب یہ دلفریبیاں درخورِ نظر نہیں!
مل گیا نگاہ کو ذوقِ حُسنِ خوش تریں!

زید اور بکر کے تو رہے ان کو نام یاد
عاشق کے نام کو وہ فراموش کر گئے!

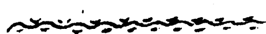
رُباعی

آلے جو دھوئیں سے داغ ہو جاتے ہیں
کیا سائے میں گم سراغ ہو جاتے ہیں؟
شو دہ ہے وہ تیزہ کُندہ نظروں ہی کا
جس دُھند میں گُل چراغ ہو جاتے ہیں!

(جون ۳۴ء)　　　غیر مطبوعہ

پنکھڑیاں

تسخیرِ کائنات کا ارمان ہے اِسے
شوخی تو دیکھیے مرے مشتِ غبار کی



اِختیار اُٹھنے پہ بھی حاصل ہو اُنکو اختیار
میری مجبوری مٹے بھی مِٹ کے مجبوری رہے



وہ شریکِ زندگی دے یہ دعا ہے تجھسے یارب!
جو سوائے تیرے سب سے مجھے بے نیاز کر دے



نقل کا ہے یہ کمال اصل نظر سے گر جائے
اب جب محو ہو وہ لمحہ تو کچھ یاد نہ آئے

یہ ظلم اپنی کلائی پہ کیوں روا رکھا؟
خود اپنے پہلو سے پیکاں کو پار کر دیتا

چشمِ کوکب کے اشارے سے یہ تاباں نکلے تھیں
رات بھر اُس نے کہاں مجھکو بھٹکتے دیکھا

مرے خون سے یہ مصرع نقش کر دو بابِ مسجد پر:
'یہ بزدل گھس گئے حجروں میں جب وقتِ جہاد آیا'

"کوئی شہیدِ وطن محوِ خواب ہے اِس میں
گُلِ مزار سے بوئے وفا نکلتی ہے

فضائے ہند ہے مصروف نالہ و ماتم
ہر ایک ذرّے سے غمگیں صدا نکلتی ہے"
(اخبار کرم دیرہ)

جس نے مجھے کیا ہے محبت سے آشنا
وہ سحر آفریں وہ فسو مگر تمہیں تو ہو



تیرے رُخ سے رُخ بدلتی ہے زمانے کی ہوا
"انقلاب! اپنے ہواخواہوں میں بھی دیکھ انقلاب"



نہ چھیڑ مجھکو دلِ آزار دیکھ رہنے دے
میں الجھنوں سے ہوں بیزار دیکھ رہنے دے



یا مٹا دوں میں اس قلم سے انھیں
یا مرا یہ قلم، قلم ہو جائے!



مشرق و مغرب میں جس سے انقلاب آنے کو ہے
وہ نقیب امروز و فردا بے نقاب آنے کو ہے

نظر حیراں تھی کیسے پو پھٹے گی اِس شبستاں سے
ندا آئی شمالی ہند کے چاکِ گریباں سے



میں جو خاموش تھا اب تک تو شرافت تھی مری
ورنہ ممکن تھا کہ تُم حد سے تجاوز کرتے؟



تری نمود میں صبحِ بہارِ علم و ادب!
ترے شگفتہ لبوں پر تجلّیاتِ سخن!!



ہمارے مبصّر بھی ہیں کیسے کیسے!



جس نے دیکھا اُسے وہ شاد ہوا



(ستمبر ۱۹۳۲ء) مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۰ ستمبر ۱۹۳۲ء)

سرمایہ

سرمایہ سے ہے گرمیٔ بازارِ اقتصاد
بے مایہ کاروبار ہے افسردۂ کساد
خوشحالیٔ بلندترِ انسان کو ہو نصیب
گر حاصلِ حیات ہو آپس کا اعتماد!

(اوائل نومبر ۳۲ء)

مطبوعہ سرورق رسالہ "سرمایہ" (ماہوار) لدھیانہ

(شمارہ نومبر ۳۳ء اور دیگر شمارے)

کیا کہوں!

شعر و ادب، تکلف بے روح و آب و رنگ
کچھ ایسی خامیاں ہیں زباں میں کہ کیا کہوں!
ہر تہہ بہ تہہ شگفت پہ نامحرمی کی آڑ
پیرائے ہیں وہ حسنِ جواں میں کہ کیا کہوں!
ہر پنکھڑی نثار اچھوتی نمود پر
ندرت ہے وہ شگفتنِ جاں میں کہ کیا کہوں!
پاسنگِ اصل بھی نہیں پرتو مجاز کا
جلوے ہیں ایسے ایسے جہاں میں کہ کیا کہوں!
تخییل شرمسار، محاکات منفعل،
وہ حسرتیں ہیں تشنہ بیاں میں کہ کیا کہوں!

(وسط اپریل ۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ "مساوات" امرتسر (۳۰ اپریل ۳۳ء)

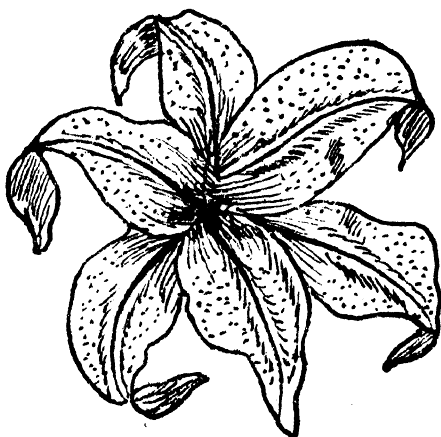
غلام

(ماخوذ از لوویلؔ[۱])

وہی بیدردہیں دراصل زمانے میں غلام
دیکھتے جائیں غلاموں کو جو درماندۂ دام
مگر اظہار کی ہو ان کی زبانوں کو نہ تاب
مُہرِ لب ہائے خموشی ہی رہے جذبۂ خام
وہی جو اِس کی بجائے کہ بصد شوق بنیں
ہدفِ ہرزہ و نفرین و مزاح و دشنام
جورِ طلبی سے گریزاں ہوں بصد حیلہ و عذر
سُوئے آسودگیٔ خلوتِ کنجِ گمنام!

۲ر جولائی ۱۹۳۲ء مطبوعہ "پیغام عالمگیر" لودیانہ (اگست ۱۹۳۲ء) ~~(غیر مطبوعہ)~~

۱؎ Lovell



الہامِ عشق!

کامریڈ جواہر لال نہرو کو پیامِ اسلام

داعی:۔ کامریڈ حسن لطیفی (صحافی)

میں اِس نظم کو منشی چھپت رائے مالک رائٹرز آرٹ پریس لدھیانہ کے "اِنکارِ طباعت" پر بصد ادب و احترام معنون کرتا ہوں! لطیفی

اے کہ تجھ سے نہیں پوشیدہ ترے ہند کا حال
اے کہ تسلیم ہے تیری فراست کا کمال!
اے کہ جھڑتے ہیں ترے منہ سے سکوں سوز شرار
اے کہ زیبا ہے تجھے، کہلائے جو تو شعلہ مقال!
یوں حریفوں کے رجز تیری گرج سے لرزاں
جیسے ضرغام کی چنگھاڑ سے تھرائیں شغال
بے پناہی میں جو ہے خامۂ رُو سو کا جواب
تیری کلکِ گہر افشاں میں ہے وہ سحرِ حلال

تیرے عرفان میں ہے جوہر وجدانِ کرشنؑ
تیرے ایقان میں ہے جذبۂ ایمانِ بلالؓ
تجھے منظور ہے دستورِ عوام و جمہور
تجھے ملحوظ ہے آزادیٔ خاصِ عمّال
جن کو ابریشم بالش ہے خود اپنا بازو
جن کے سونے کیلئے سیج ہے گھاس اور پیال
جن کے پینے کے لئے خونِ جگر ہے امرت
جن کے کھانے کیلئے نوش ہے اشجار کی چھال
تیری خواہش ہے سرافرازیٔ دہقان و کسان
چاہتا ہے انھیں دیکھے، متموّل، خوشحال
کیا ہی بیساختہ جملہ تیرے لب سے ٹپکا:
"خوب ہیں خواب بھی، یہ خواب سہی میرے خیال"
جانفزائی کا وہ اعجاز ہے جملوں میں ترے
کہ ہم وزیرہیں غیرت دہ جرعاتِ زلال

"شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز"[1]
رُوبرُو ہوں جو ترے حُسنِ عمل کے خط و خال
خضرِ منزل ہے ہمارے لئے تیرا ایثار
مشعلِ راہ ہے بھارت کیلئے تیری مثال
ہاں ترے فکرِ فلک رس میں جو شک ہے تو یہی
تجھ سے شاہد ہے نہاں ہند کی کروٹ کا مآل
ڈگمگائے ہے جو یوں ڈوب نہ جائے یہ کہیں
ناخدا! جان پہ کھیل اور سفینے کو سنبھال
برہمن زادِ اجل کا قیدی ہے خود اپنا قیدی
بن گئیں اس کی گرفتار نگاہیں خود جال
لہر گنگا سے جو آئی تھی وہ گنگا میں گئی!
بازگشت اب تو ہے اُس لہر کی اک امرِ محال
تیرے نزدیک وہ بوسیدہ و مہمل ہی سہی
تجھ سے اقبال نے پُوچھے تھے جو چند ایک سوال

[1] مصرع غالب

اِن کے معیارِ عمل سے مگر اندازہ نہ کر
کیونکہ نکہت سے ہیں انسان کے ایسے اعمال
کس جماعت کے ہیں بے غلّ و غش اطوار و شعار
اور بیگانۂ تقصیر ہیں کس کے افعال؟
گرچہ ناچیز ہیں پھر بھی ہیں یہ تیر و ترکش
یہی "ذرّے" رہے برسوں وطنِ ہند کی ڈھال
صبحِ فرغانہ سے تا غربتِ شامِ رنگون [۵۳]
دیکھ آ تاریخِ سہ صد سالۂ معراج و زوال
پھر اُن ایامِ پُر آشوب کی کڑیوں کو ملا
جب ہوا سلطنتِ مغلیہ کا اضمحلال
حُسنِ ابدال میں ہیں جیسے نشاناتِ عتیق
ارضِ لُد سے یونہی منسوب ہے یادِ ابدال [۵۴]

---

۵۳ بہادر شاہ ظفر کی حراستگاہ اور مدفن
۵۴ شاہ شجاع اور شاہ زمان اخلاف احمد شاہ ابدالی

اسی افتادہ نشیمن میں ملی اُس کو پناہ
جس کو ٹیپوؒ نے لکھا نامۂ پیمانِ وصال[۹۵]

ہے یہی ہند میں عیسائی مشن کا سنگم
یہیں ملتے ہیں مسیحائی مبلّغ ہر سال

یہی سرچشمۂ صد فتنۂ مرزائیت
یہی زائیدہ فتن کی لحدِ استیصال

بخدا! جھوٹ نہیں آمدِ مہدی کی خبر
قتل ہوگا اسی مرکز پہ کسی دن دجّال

رگِ یاجوج سے پیوستہ ہے ماجوج کی رگ
تاشقند اور بخارا سے بہ قفقاز و یُرال

یہی تفسیرِ "سیاتو" ہے کہ جنّاتِ محاذ
سرِ بآسانکل آنے کو ہیں از حدِّ مسال

تُو نے سوچا بھی ہمالہ کا یہ جھٹکا کیا ہے
کر دیئے زیر و زبر جس نے بہار و نیپال!

۹۵ بہ سلسلۂ پین اسلامزم

تو نے سمجھا بھی یمِ زرد[۶] کی طغیانی کو
سوگ میں جسکے ہے آفت زدہ چین آج نڈھال؟
تو نے دیکھے تو ہیں دیرِ دزہ کسوف اور خسوف
یہ بھی جانا، ہے ظہورِ ان کا کس آشوب کی فال؟
یہ بشارت ہے کہ آنے کو ہے باطل پہ بلا
بن کے بارود، بھنور، برق، بگولہ، بھونچال
گردشِ چرخ نے تاریخ کو دُہرایا ہے
ٹھہری ردِ کشتش سے وہی مہروں کی ہی چال
ہیبتِ جنگ سے ہیں لرزہ براندام حریف
سرِ افرنگ پہ بیتاب ہے شمشیرِ کماں
نیل گردوں سے اُبھرنے کو ہے عنوانِ طلوع
دیکھ! بادل میں سبک گام ہے پھر تازہ ہلال



(یکم فروری ۳۴ء) قلمکار (اوائل فروری ۳۴ء)

[۶] (دریائے زرد)

پیشکش

بحضورِ عالیجناب، مستطاب، فراست مآب، ثریّا رکاب، اعلیحضرت غازی

امان اللہ والانصیب تسخیرِ خداداد تخیمہ قلب ایشیا خلد اللہ اجلالہ

شگفتِ نو دمن دمن، شباب نو چمن چمن،
مگر چہ ایں ستمگری، توئی ہنوز بے وطن،
بیا بیا امانِ ما، ـــــ شگفتِ رائیگان ما،
بہارِ سرگرانِ ما، ـــــ امانِ ما، امانِ ما
بیا بیا اماں بیا!

تغیّراتِ تاج و دار، نو بہ نو بہ صد ہزار
صداقتِ "نُدٰاوِلُ"[1] از ابن بابر[2] آشکار

بیا بیا امانِ ما، ـــــ بہ یاد رفتگان ما،
تصرّفِ زمانِ ما، ـــــ امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

[1] تلک الایام ندا ولھا بین الناس [2] ہمایوں

۵۳

نویدِ صبحِ نَو بدہ، کہ طورِ جعفری گذشت،
بنائے عہدِ نو بنہ، کہ دورِ نادری گذشت

بیا بیا امانِ ما، —— مہیب قہرمانِ ما،
قیامتِ جہانِ ما، —— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

چکیدۂ فشارِ خُوں، قلم قلم، ورق ورق
تراوشِ گلاب گوں، اُفق اُفق، شفق شفق

بیا بیا امانِ ما، —— نگر بہ ایں بیانِ ما،
نیوش داستانِ ما، —— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

سکُونِ ما، جنُونِ ما، خیال کُن جنُونِ ما،
ہزار تندر آفریں خروشش ہائے خُونِ ما،

بیا بیا امانِ ما، —— ز راہِ امتحانِ ما،
ببیں تب و توانِ ما، —— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

۵۳ میر جعفر (غدارِ بنگال)

گمانِ فتحِ شہریار، سائۂ یقینِ ما
قیاس کُن ندیمِ ما، چہ پایۂ یقینِ ما

بیا بیا امانِ ما —— جلالِ عزّ و شانِ ما
مجاہدِ جوانِ ما —— امانِ ما، امانِ ما

بیا بیا امان بیا!

شبے میانِ گردش و طواف گفت ایں قمر
کہ رستخیزِ ایشیا بہ انتظارِ یک شرر

بیا بیا امانِ ما —— تجلّیٔ شبانِ ما
فروغِ کہکشانِ ما —— امانِ ما، امانِ ما

بیا بیا امان بیا

عناں بہ موجِ یم فرو، سپر بہ رود ہم فرو
ز مرز بوم مازنی[۵۴] بیا ز راہِ ماسکو

---

۵۴ قائدِ انقلابِ اطالیہ

بیا بیا امانِ ما، ——— خدنگِ ما، کمانِ ما،
حسامِ ما، سنانِ ما، ——— امانِ ما، امانِ ما
بیا بیا اماں بیا!

بیا بیا "امیرِ کامگار" [۵۵] زندہ رودِ ما [۵۶]
بیا بیا بہ شرعتِ روانیِ سرودِ ما،

بیا بیا امانِ ما، ——— امامِ غازیانِ ما،
سروشِ کاروانِ ما، ——— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

ہمہ تپاکِ چشمِ تر، ہمہ تشکرِ نظر،
تصدّقِ مراجعت، نثارِ خاکِ رہگذر

بیا بیا امانِ ما، ——— پذیرِ امتنانِ ما،
شہِ شہنشہانِ ما، ——— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

---

۵۵ بہ حوالہ "پیامِ مشرق" ۵۶ علامہ اقبال (بحوالہ "جاوید نامہ")

نگاہِ ما، اشارہ سنج قبلۂ سلام ما،
خیالِ ما، کمندِ نارسائیٔ پیام ما،

بیا بیا امانِ ما —— شفیق و مہربانِ ما،
امیدِ بیکسانِ ما —— امانِ ما، امانِ ما،
بیا بیا اماں بیا!

سرشکِ ما، فسانۂ خموشِ التجائے ما،
سکوتِ ما، گدازِ بے زبانیٔ دعائے ما،

بیا بیا امانِ ما —— امین و رازدانِ ما،
انیسِ روح و جانِ ما —— امانِ ما، امانِ ما،
بیا، بیا، اماں بیا!

(۹ر جنوری ۱۹۳۴ء)

قلمکار (۱۵ر جنوری ۳۴ء)

مطبوعہ روزنامہ "تریاق" لاہور (۱۸ر جنوری ۳۴ء)

فلسطین

خونریزیٔ اعراب سے رنگیں ہے فلسطین
دورانِ خزاں میں بھی بہاریں ہے فلسطین
خونِ شُہدا سے ہے زمین احمر و شاداب
یعنی سبدِ تازۂ گلچیں ہے فلسطین
یا فا کے سرِ باب سے تا بیتِ مقدس
اک محشرِ نظارۂ تکفیں ہے فلسطین
تاراجِ ستم ہائے تمرّد ہیں ھلالی
برباد بہیمیتِ سنگیں ہے فلسطین

ہمرنگ ہے جو رزم صلیبی[1] کے لہو کی
وہ سُرخیٔ افسانۂ دوشیں ہے فلسطیں

گو اور بھی اس دہر میں ہیں منتدب[2] اقطاع
مخصوصِ کج آئینیٔ آئیں ہے فلسطیں

جس "امن" کے سائے میں پھر آئے ہیں یہودی
اُس "امن" سے خوں گشتہ و خونیں ہے فلسطیں

چھائے ہیں پنپتے ہوئے خوشوں پہ نئے دل
بلفور[3] کا باغیچۂ پائیں ہے فلسطیں

ہمقسمتِ فرہاد ہے جانبازیٔ مُسلم
موسائی ہے پرویز تو شیریں ہے فلسطیں

---

[1] (Crusade)

[2] (Mandatory)

[3] (Lord Balfour)

خوش اُمّتِ عیسیٰ سے ہے ذرّیتِ موسیٰ
دونوں کے لئے ہیکلِ تحسیں ہے فلسطین
وہ ہیکلِ تحسیں جو سمجھتے ہیں تو سمجھیں
پَر اُن کے لئے خندقِ نفریں ہے فلسطین
تاریخِ مکافات چٹانوں پہ ہے منقوش
عبرت گہِ اقوام وسلاطیں ہے فلسطین

ارضِ لد
بتاریخ ۳۰ نومبر ۱۹۳۳ء

قلمکار (اواخر نومبر ۳۳ء)

مطبوعہ جریدہ "پیغام" لکھنؤ (۲ دسمبر ۱۹۳۳ء)

مطبوعہ روزنامہ "آزاد" لاہور (۸ دسمبر ۳۳ء)

نیاز و نیائش

تمہید تری آغازوں میں اور نام ترا عنوانوں میں
رُوداد تری رومانوں میں اور یاد تری افسانوں میں
تو گیتوں میں، تُو گانوں میں، تو تانوں اور ترانوں میں
تُو باتوں اور بیانوں میں، تُو لہجوں اور زبانوں میں
عرفان ترا ہے دھیانوں میں اور دھیان ترا عرفانوں میں
وجدان ترا ہے گیانوں میں اور گیان ترا وجدانوں میں
تُو ویدوں اور زبوروں میں، رشیوں کے قدیم صحیفوں میں
توریتوں میں پاژندوں میں، انجیلوں میں، قرآنوں میں
تُو ہیکل کے ہر دفتر میں، تو ستّے کے ہر شستر میں
یکساں ہے ترا فیضان رواں بیگانوں اور یگانوں میں

گیتی کے نقادہ ذرّوں سے گردوں کے درخشاں تاروں تک
ہم دیکھ رہے ہیں تیری جھلک، پست اور بلند نشانوں میں
پستی کی بھول بھلیاں ہیں، آکاش کی کاہکشانوں میں
ایتھر[۵۱] کے طلسمی زینوں میں، سیاروں کی افسانوں میں
سعدین میں نسرِ طائرؔ میں، پروین کے رخشاں خوشے میں
کرنوں کی ہزاروں گرہوں میں، اور چمکیلے دُردانوں میں
منڈلائی ہوئی ہیں تیری حدیں، اور چھائی ہوئی ہیں تیری تہیں
صحراؤں میں دریاؤں میں، کہساروں میں، میدانوں میں
تو موتی کی تابانی میں، تو شعلے کی رخشانی میں
تو بجلی کی لمعانی میں، تو سارے برق افشانوں میں
تو راتوں اور اندھیروں میں، تو صبحوں اور سویروں میں
تو لمحوں اور دقیقوں میں، تو قرنوں اور زمانوں میں
تو ساری خلوت گاہوں میں تو ساری جلوت گاہوں میں
تو گھاٹوں اور کناروں میں تو کنجوں اور کرانوں میں

۵۱ ایتھر Ether

تُو گھوم رہا ہے ہر لمحہ، تُو جھوم رہا ہے ہر لحظہ
تخئیلوں کی پروازوں میں اور خوابوں کی طیرانوں میں
تُو دل کی دھڑکن میں غلطاں، تُو آنکھ کی پُتلی میں رقصاں
تُو آہوں اور دعاؤں میں، تُو اشکوں اور فغانوں میں
تُو پیاروں اور پریموں میں، تُو پریتوں کی سب ریتوں میں
تُو انسانی پروانوں میں، تُو پریوں کے رُومانوں میں
چرچا ہے تری فیّاضی کا ناداروں اور فقیروں میں
سرگوشیاں تیری رحمت کی سلطانوں اور خاقانوں میں
تُو ظلمت کے تہہ خانوں میں، تُو عسرت کے زندانوں میں
تُو رونق کے کاشانوں میں، تُو عشرت کے ایوانوں میں
تُو مغربیوں کے مشرب میں، تُو مشرقیوں کے مذہب میں
اوراک ترا فرزانوں میں، احساس ترا دیوانوں میں
نشّہ ہے ترا صہباؤں میں، اور بادہ ترا میناؤں میں
مستی ہے تری میخواروں میں، اور کیف ترا میخانوں میں

بالیدگی تیری پودوں میں اور تازگی تیری پھولوں میں
رس تیرا پھلوں اور گھونگوں میں، اور حسن نورس مرجانوں میں
تو ناؤ کی نرم روانی میں، تو لہروں کی جولانی میں
گمبھیر سبک ہلکوروں میں، گھنگھور گراں طوفانوں میں
ڈھونڈھا ہے تجھے بیتابی نے، پایا ہے تجھے بیتابی میں
واماندہ نگاہوں نے اکثر پوجا ہے تجھے بت خانوں میں
آوارہ ہے آواز کوئی، ہاں جھوم رہی ہے گونج تری
ویرانوں کے سناٹوں میں، سناٹوں کے ویرانوں میں
دوری ہے تری نزدیکی میں اور قربت تیری دوری میں
تو پوشیدہ محدودوں میں بے پردہ بے پایانوں میں
کچھ اور یونہی بیگانہ رہی، ہاں اور ذرا سی بے مہری
بس اب تو مٹنے والا ہوں میں مٹ کے ترے دیوانوں میں!

(۱۰ فروری ۱۹۴۲ء) قلمکار (۳۰ فروری ۱۹۴۳ء

نیرنگیٔ افتاد

(انسان کے ایک خاص نقطۂ نظر سے)

پی کے تھوڑی سی مئے ہستی بہک جاتا ہوں میں
ہر قدم پہ لڑکھڑا کر ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
خود ہنسی ہنستی ہے اس کم ظرفیٔ طفلانہ پر
کچھ کھلونے سے جو مِل جاتے ہیں اِٹھلاتا ہوں میں
جیسے اُڑتا ہو کوئی اُونچی ہواؤں میں کہیں،
ویسے ہی پروازِ خوش فکری میں لہراتا ہوں میں
میری ہست و بود تو لے دے کے ایک مشتِ غبار
اس پہ یہ دعوے ستارے توڑ کر لاتا ہوں میں
چیستاں داری ہے میری چیستاں سی چیستاں
گر سُلجھتا ہوں کبھی پھر خود کو اُلجھاتا ہوں میں

منزلیں ہیں سینکڑوں اور خضرِ منزل سینکڑوں
کس کو چھوڑوں کس کو پکڑوں رہ میں گھبراتا ہوں میں

ہر نئی شے کو میں کر لیتا ہوں عصیاں میں شریک
اور پھر مفروضہ اندیشے سے تھراتا ہوں میں

اپنی معذوری سے جب کر ہی نہیں سکتا گناہ
اُف رے جرات! پارسا بن بن کے اتراتا ہوں میں

سلسبیل و کوثر و تسنیم و غلمان و کنیز
آہ! ان وعدوں سے کیسے دل کو بہلاتا ہوں میں

کر بھی لیتا ہوں گریز اس خود فریبی سے اگر
بھول کر اپنے تئیں پھر سے پلٹ آتا ہوں میں

صورتِ برعکس کا ہر چند ہوتا ہے یقیں
لیکن اپنے آپ کو سختی سے جھٹلاتا ہوں میں

جانتا ہوں جامِ خوشکامی ہے اک جوئے سراب
پھر بھی اپنی پیاس کو تھک تھک کے بہکاتا ہوں میں

آنکھ کھلتی ہے کبھی گر زخمِ دل کی ٹھیس سے
دیکھکر ہیئت کذائی اپنی شرماتا ہوں میں

میرے دل نے میرا دل ہوکر کیا خود کو خراب
اپنے سے بھی جائے ہے وہ جس کو اپناتا ہوں میں

ہر مہم، تعیینِ حد سے عام، "سمجھوتے" کا نام [۱]
کیوں خیالِ نفیِ "این و آں" سے ٹکراتا ہوں میں

چاہتا ہوں کچھ، کئے جاتا ہوں کچھ، ہوتا ہے کچھ
بہتری کی سعیِ لاحاصل پہ پچھتاتا ہوں میں

رکھ بھی دوں اُمّیدِ فردا میں گرو اپنی خودی
ہوتے ہوتے بار آور خود ہی بک جاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں رات دن فطرت کی یہ بوالعجبیاں
اور اس پہ ذمّہ دار اپنے کو ٹھہراتا ہوں میں

میری دو آنکھیں فقط اس حال میں غمخوار ہیں

---

[۱] Compromise

لگا ہے خود رو رہا ہوں لگا ہے ان کو تڑپاتا ہوں میں
چیخ چیخ اٹھتا ہوں لگا ہے انتہائے کرب سے
لگا ہے ہذیانِ خمار انگیز میں گاتا ہوں میں
نشّہ جب محسوس ہوتا ہے اُترتا سا مجھے
"اختیار و جبر" کے پنجے میں جھنجلاتا ہوں میں
جسم و جان و رُوح کر ڈالے عبودیّت کی نذر
پھر بھی خود سر، خود غرض، خود کام کہلاتا ہوں میں
بس چلے تو پیس ڈالوں یہ نظامِ کائنات
دل میں ایسا اشتعالِ سرکشی پاتا ہوں میں
میری نظریں بھی اسیر اور میرے بازو بھی اسیر
آہ! پھر کیوں خود کو سرتابی پہ اکساتا ہوں میں
خاکیم گرچہ، ولے آتش بجاں افتادہ ام
من ندانم ایں چہ وحشت، انقلاب آمادہ ام

(۱۴ر فروری ۱۹۳۴ء) — قلمکار (۲۰ر فروری ۱۹۳۴ء)

اب کس کو پوچھتے ہو؟

لطیفی صاحب ہمارے شہر کے مایۂ ناز جواں سال ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ کا ہر شعر حقیقت کا دیباچہ ہوتا ہے۔ شوکتِ لفظی اور بلندیٔ تخیل آپ کے کلام کا جوہر ہے ——— (مدیر "تفریح")

کھویا ہوا مسافر جب حسرتوں کو لے کر
دُنیا سے جا رہا تھا آمادۂ فنا تھا
آتے تو آخرِ شب تھا جاں بلب کوئی جب

اب کس کو ڈھونڈتے ہو؟

اب کس کو پوچھتے ہو؟

رکھا ہے کیا یہاں اب؟

گُم گشتہ دِل کی تاریں
موہوم یادگاریں
خاموش بے نشانی
خاکسترِ جوانی
کیوں اب مَسل رہے ہو
چٹکی سے مَل رہے ہو
اب کس کو ڈھونڈتے ہو؟
اب کس کو پوچھتے ہو؟
ناحق مچل رہے ہو!

فانوسِ دِل میں کیا تھا
ننّھا سا اک دیا تھا
جھونکے سے تلملایا
کچھ دیر ٹمٹمایا
پھر بُجھ کے رہ گیا وہ
"اُسے کاش" کہہ گیا وہ
اب کس کو ڈھونڈتے ہو؟
اب کس کو پوچھتے ہو؟
جھونکے میں بہہ گیا وہ!

نایاب ہو چکا گُم　　پاؤ گے کِس طرح تُم؟
پانے کی رہ نہیں ہے　　کوسوں پتہ نہیں ہے
اوجھل ہے حدِّ فاصل　　دھندلا گئی ہے منزل
اب کس کو ڈھونڈتے ہو؟
اَب کس کو پوچھتے ہو؟
دِل ہے نہ وحشتِ دِل!

جاڑے کی شام اندھیری　　اور بدلیاں گھنیری
بستی میں بَن کا موسم　　اگہن پَون[۱] کا موسم
اوڑھے ہوئے لبادہ　　گلیوں میں پا پیادہ
اب کِس کو ڈھونڈتے ہو؟
اب کِس کو پوچھتے ہو؟
دِل میں ہے کیا ارادہ؟

[۱] تیز ہوا

ہو بھی اگر کہیں وہ ملنے کا اب نہیں وہ

گو پھر سے بن سنور لو اک تازہ سانگ بھر لو

عذرِ پیام لاؤ ہرکارہ بن کے آؤ

اب کس کو ڈھونڈتے ہو؟

اب کس کو پوچھتے ہو؟

لو رستہ، جاؤ، جاؤ،

(۷، فروری ۳۴ء) مطبوعہ جریدہ "تفریح" لدھیانہ — ۵ مارچ ۱۹۳۴ء

نیلا ناگنی

ذیل کی تراوش وسطِ دسمبر ۱۹۳۳ء کی یادگار ہے،
چند در چند وجوہ کی بنا پر اس کی طباعت معرضِ التوا
ہی میں رہی،

۴ر فروری ۱۹۳۴ء کو جو مشاعرہ مقامی بزمِ اقبال
کے زیرِ اہتمام ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا تھا اس کے دوران
میں یہ نظم بھی پڑھکر سنائی گئی تھی،

اس مشاعرہ کے ایک ہفتہ بعد بندرگاہِ کلکتہ سے یہ
خبر آئی کہ مس نیلا ناگنی اپنے بیٹے سرلویس کے ہمراہ
"City of Elwood" نامی جہاز میں
اپنے وطن مالوف (امریکہ) کو واپس جانے کے لئے
پا در رکاب ہے ——— !

اے خود اپنے نام سے بیزار نیلا ناگنی!

اے دلِ ناکام سے ناچار نیلا ناگنی!

اے تھکان اور غم سے چُور اے خوار نیلا ناگنی!

تُو کہاں اُلجھی؟ یہ دُنیا تو ہے کانٹوں سے گھنی

یہ پریشاں بال، یہ قشقہ، یہ آہیں، یہ سفر،

کیسے تیور ہیں یہ اے اَلّھڑ، انیلی، کامنی!

کھینچ لائی راہِ غربت کی کُجالیاں میں تجھے،

تیری رُوحِ تازہ پر[1] کی جُستجوئے روشنی

جگ ہنسائی اور رسوائی تری قسمت میں تھی

ورنہ اے جوگن! ہے تُو انمول ہیرے کی کنی،

اے حسیں کوئل! تری فطرت ہے کیسی ناشکیب

ہر زباں پر ہے ترا افسانۂ ناگفتنی،

---

[1] Fresh-fledged

دِل تڑپ اُٹھتا ہے تیری خودکشی کی تان پر
کِس قدر دِل سوز ہے تیرے جنوں کی راگنی!
تیری وحشت لے گئی گوکل کے رَمنوں میں تجھے
جن میں تھی چھِٹکی ہوئی نیچر کی نِکھری چاندنی
شیام سُندر کی نہ اُس سُشرما میں تھی کوئی ادا
آہ! جِس کی پریت میں مِس کُک سے تو نے ناتا توڑا دھا بنی
ٹھوکریں کھاتی تھی جب گُم ہو کے بندرابن میں تُو
آبلہ پائی تری ہو گی غضب کی دیدنی،
ہائے اُس کی پارسائی جِس نے لُوٹا تیرا حُسن
رہبری کے رُوپ میں اُف رے مقدّس رہزنی!
باؤلی خود ہو کے تجھ کو "باوری" کہتی ہے وہ
آہ! یہ دُنیا ہے کِتنی سِفلہ پرور آور دَنی
چند ٹیسوں کی کسک سے کیا بگاڑے گی ترا؟
ناروا الزام اور دشنام کی نشتر زنی

کس کے دل کا گوشہ ہے لوثِ گنہگاری سے پاک؟

کون ہے سنسار میں بیگانۂ تر دامنی؟

لغزشِ جذبات سے آزاد بھی ہے کوئی ذات؟

پھر تری وارفتگی پر کیوں ہو ناوک افگنی؟

آ شرم والوں کو بکنے دے کہ تیرے ذوق میں

بیسواؤں سے سوا ہے معصیت کی چاشنی

چھوڑ کر یہ بھیس اور پردیس ہالی وڈ کو جا

کب تک ان بے مہر حیوانوں میں کرب جاں کنی؟

بتاریخ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء

(غیر مطبوعہ)

Hollywood ۔ ہالی وڈ

سلیقہ

(ایک پختہ کار کے نقطۂ نظر سے)

سلیقے سے زباں گر ہو نہ خوگر
تو گُفت و خوائند کے کلمے ہوں ابتر
جو صرف و نحو سے وہ آشنا ہو
تو ہر مضمون ادا ہو جائے فر فر
یونہی ہے زندگی میں کار فرما
روابط اور ضوابط کی گرامر
لگاؤ اور اس کا رکھ رکھاؤ
اضافت کی طرح ہے ربط آور
نہ ہوں گر رشتۂ آئیں تو ہے تُف
لباس و خورد و نوش و گفتگو پر

تمدّن اور معیشت کے مشاغل
نپٹتے ہیں قرینے ہی سے بہتر

جو سچ پوچھو یہ بنیادی سبق ہے
نظامِ گردشِ ہستی کا محور

عبور اس پر نہ ہو جب تک کسی کو
"سلاست" ہو نہیں سکتی میسّر

ہر اک مشقِ عمل ہے خام کاری
نہ جب تک مبتدی کو ہو یہ ازبر

زباں کی طرح اس میں بھی ہے لازم
لحاظِ "جمع" و "واحد" "مادہ" و "نر"

مثالِ نطق اس کے باب میں بھی
ہیں "مشتق" اور "جامد" اور "مصدر"

"جزا" اور "شرط" "مثبت" اور "منفی"
"چھپا" و "راست" اور "جفت" و "طاق" اکثر

"کرے گا" "ہوا" "کون" "کب" "کیوں" "کہاں تک"
"کسے" "کس طرح" "کیسے" اور "کیونکر"

مگر ہم روز مرّہ زندگی میں
یہ سب "پیشے" بھلا دیتے ہیں اکثر

جبھی ہوتی ہے "گردانوں" میں لکنت
جبھی کھاتے ہیں ہم چلنے میں ٹھوکر

اگر سب تجربے ہم یاد رکھیں
ہماری زیست ہو جائے میسر

(۱۸/ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء)

قلمکار (۲۷/ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء)



صدا بہ صحرا

"تلخ تر زن حدیِ نیم شبی"

ہمہ صحرا بہ خوابِ صحرا زاد!

ہمنشیں! مجھ کو رہا ہے ذوقِ تپش
آ! کریں تازہ راہ و رسمِ جہاد

یوں ہوں وارفتگی سے گرمِ ستیز
کہ اُلٹ دیں بساطِ اہلِ فساد

اصلِ انصاف ہے اصولِ قصاص
زخمِ خسرو ہے پنبۂ فرہاد

کچھ نہ ہوگا عدم تشدد سے

زورِ بازو سے چارۂ بیداد

وہ نہ مانیں گے از رہِ تسلیم

وجہِ پندار ہے سرِ منقاد

نوکِ شمشیر ہی سے ہے عقدہ کشا

جنگ ہی ہے جوابِ استبداد

خون میں ہو جو فاسد آمیزش

اُس کا درماں ہے نشترِ فصّاد

شورشِ کفر کی سزا ہے یہی

کہ پڑے اس پہ تازیانۂ عاد

وحیِ قرآں کے ماننے والو!

تمہیں حکم "وقاتلو" بھی ہے یاد

خالد و طارق، صلاح و بروس[1]

تھے ہماری ہی قوم کے افراد

[1] خیر الدین بروس پاشا

ابن قاسم کی ترکتازِ جری
آج تک سندھ میں ہے مظہرِ داد
رنگ آزادیِ بلوچستاں میں ہے ثبت
غزنوی یادگار کی رُوداد
شیر دل اور پختہ جاں تھے بزرگ
مضمحل اور خام ہے اولاد
مصلحت کوش ہے خروش اپنا
اور خطر سے بے نیاز اجداد
اپنا ذوق فروش ہے ظلماتِ پسند
جس کے نیچے ہیں جنتیں آباد
خود ہی تو نہیں ہو تم اپنی کمک
دوستوں سے کرو نہ استمداد
اُٹھ کے پھیلاؤ دہر میں اسلام
اور مٹاؤ ضلالتِ الحاد

کہہ چکے ایک بار جب لبیک
پاک پھر کس کا ؟ ہر جیبہ باد باد
جو مسلمان کو کرے تاراج
تم بھی کر دو اُسے دہیں برباد
دیکھ لو کھول کر کلام مجید
ہے یہی ہم کو حکم ربِ جواد
انتقام ستمگراں ہے قریب
اب چھپیگا کہاں ستم ایجاد
ہو بلا سے غنیم چابک دست
چاق چوبند منچلا کیاد
روک سکتی نہیں کوئی طاقت
اب تو ہو کر رہیں گے ہم آزاد
تاؤ سے پیچ و تاب کھائیں رقیب
اور اندھے ہوں غیظ سے انداد

دیرگیری و تیز و تغیر ہی
طبع فطرت کی ہے یہی افتاد
ہم کو بھولا نہیں گذشتہ سماں
یاد ہے شانِ دہلی و بغداد
کٹنے والی ہیں اپنی زنجیریں
ٹوٹنے کو ہے طاقتِ صیاد
جس سے پانی ہے خونِ پانی پت
ارضِ لُد ہے وہ انتخابِ بلاد
نقطۂ انجذاب اس کا مآب
حیطۂ انشعاب اس کا سواد
ہونے والا ہے عشق کا آغاز
پڑنے والی ہے اک نئی بُنیاد
رکھنے والے ہیں ہم اک ایسی اساس
جس پہ قربان ہر گشادہ نہاد

سرنگوں جس سے ہر بلند ستون

سجدہ زن جس پہ ہر فراز عماد

(یکم مارچ ۱۹۳۴ء)

قلمکار (۲۷ اپریل ۳۴ء)

شعلہ نوائی

اے ہمدمِ دیرینہ! یہ بھی ہے کوئی جینا؟
آ! تختۂ عالم سے باطل کو مٹا ڈالیں

یورپ پہ دھواں بن کر چھائی ہے سیہ بختی
آ! اس کی گھٹاؤں کو خاور سے اڑا ڈالیں

یہ کفر کی بستی ہے، موت اس پہ برستی ہے
اس کہنہ خرابے میں آ! کعبہ بسا ڈالیں!

کیا چیز ہے یہ دنیا؟ کچھ بھی نہیں یہ مایا
اللہ کے رستے میں ہر چیز لٹا ڈالیں!

مغرب زدہ قوموں کو غارت شدہ مردوں کو
اعجازِ جوانی سے آ! اٹھ کے جلا ڈالیں!

انگڑائی کے لینے تک تھی اپنی گراں خوابی
اٹھے ہیں تو اٹھتے ہی صد حشر اٹھا ڈالیں!

ٹکرائیں چٹانوں سے لڑ جائیں پہاڑوں سے
جو سنگِ گراں آئے، بازو سے گرا ڈالیں!
کہسار پہ جا گرجیں، میدان پہ جا برسیں
روکے جو کوئی ہم کو، رستے میں بہا ڈالیں!
مغرور ترا شاہِ دل تھام کے رہ جائیں
وہ سکہ بٹھا ڈالیں، وہ نقش جما ڈالیں!
دریاؤں پہ جا کوندیں، صحراؤں پہ جا کڑکیں
فردوسیِ ایراں کا شہنامہ بھلا ڈالیں!
اک مشتِ غبار ایسی شوخی سے اٹھا پھینکیں
چنگیز و ہلاکو کی شمعیں بھی بجھا ڈالیں!
رستے میں اگر اپنے جیحون بھی آجائے
اک پاؤں کی ٹھوکر سے سیل اس کا گھما ڈالیں
بجلی جو کرے چشمک جل جائے کمند اس کی
آندھی بھی اگر الجھے مٹی میں ملا ڈالیں!

مُنہ موڑ دیں تیروں کا، رُخ پھیر دیں طُوفاں کا
خود زلزلہ کے اندر اِک تہلکہ لا ڈالیں!
شعلوں کے نشیمن میں شیطان کے ایندھن میں
بارود کے خرمن میں آ! آگ لگا ڈالیں!
جو نیند سلائی تھی پومپی کو وزووس نے
عصیاں کے سفینوں کو وہ نیند سُلا ڈالیں!
آ! ایک ہی چرکے سے دِل چیر دیں باطل کا
اور حق کے اُجالے سے ظُلمت کو مٹا ڈالیں
روندا تھا کبھی ہم نے کسریٰ کے عساکر کو
آ! آج بھی بطحا کے اعدا کو چبا ڈالیں!
سہمے ہوئے کھنڈروں کی لاشیں بھی دہل جائیں
رہواروں کی ٹاپوں سے دھرتی کو ہلا ڈالیں!
جنگل کی کچھاروں میں شوریدہ نوا گُونجے
سوئے ہوئے شیروں کو نعروں سے جگا ڈالیں!

میدانِ شہادت میں یُوں دوش بدوش آئیں

جانوں کو لڑا ڈالیں جسموں کو کٹا ڈالیں

پتھر بھی پگھل جائے فولاد بھی جل جائے

خونابۂ جانبازی چھلکائیں لُنڈھا ڈالیں

ہڈّی کی چنائی ہو، اور خُون کا گارا ہو،

آزادیٔ مشرق کی یُوں تازہ بِنا ڈالیں!

بھٹکی ہوئی قوموں کو پھر سُوئے حرم لائیں

انسان کے رشتے کو اللہ سے مِلا ڈالیں!

نہوند[1] کو یرمُک[2] کو بھولے ہیں جہاں والے

ایماں کے کرشمے پھر دُنیا کو دکھا ڈالیں!

اَے ہمدمِ دیرینہ!

(۹ ر مارچ ۱۹۳۴ء) قلمکار (۲۷ ر اپریل ۱۹۳۴ء)

---

[1] نہوند عراق اور ایران کی سرحد پر واقع تھا، اس جگہ ساتویں صدی عیسوی میں تیس ہزار مسلمانوں نے ڈیڑھ لاکھ کافر ایرانیوں کو شکست دی تھی،

[2] اس مقام پر مسلمانوں نے رومن فوج کو پہلی مرتبہ شکست دی،

عشرتِ امروزہ

ایک نوجوان اوباش کے نقطۂ نظر سے:-

نہ پوچھ مجھ سے کہ کیا ہیں شباب کی راتیں
زفاف سے بھی سوا ہیں شباب کی راتیں!
نشاط و نشہ و نشو و نمو سے ہیں معمور
شگفتہ و شاہد و شعر و شراب کی راتیں!
گلاب و زعفران و لوبان و عود کے لپٹے
شمیمِ نشترِ مہتاب کی راتیں!
یہ مست عیش کی راتیں ہیں پُر مزہ ایسی
نثار جن پہ ہزاروں ثواب کی راتیں!

جب آرزوئے جوانی ہی رائگانی ہو
خراب کیوں نہ ہوں خانہ خراب کی راتیں!
وہ کیوں سُنے غمِ دنیائے سوز کی چیخیں
نصیب جس کو ہوں چنگ و رباب کی راتیں
رگوں میں گرم لہو دوڑنے کی وحشی رُت
حرارت و تپش و التہاب کی راتیں!
ہر اک جوان ہے اک کائناتِ استغنار
کہ لاجواب ہیں اس لاجواب کی راتیں
نہیں ہے کوئی بھی نعم البدل جوانی کا
جزا سے بیش بہا ہیں شباب کی راتیں!
بنا دو شوق سے سارے جہان کو کافر
مگر بڑھا دو رُخِ بے حجاب کی راتیں!
ہر اک سہاگ پہ مُہرِ دوام ثبت کروں
اگر ملیں ہوسِ کامیاب کی راتیں!

ایک نوجوان مجاہد کے نقطۂ نظر سے:-

میں جانتا ہوں یہ رازِ مجازِ ارے عیاش!
کہ بے بہا و جسترا ہیں شباب کی راتیں
مگر کمالِ وفا تو اسی میں ہے امروز
نثار کر دوں یہ انمول خواب کی راتیں
وہ جوئے میکدہ ہے خنجروں کے سائے تلے
کہ جس سے تشنہ ہیں تیری سراب کی راتیں
کشادہ سلسلہ ہے عیشِ جاوداں اُس پار
تہی گرہ ہیں یہ تیری حباب کی راتیں

(۱۹ مارچ ۱۹۳۴ء)

قلمکار (۲۷ اپریل ۳۴ء)

مطبوعہ "پیغام عالمگیر" لدھیانہ (مئی ۳۴ء)

(بچوں کیلئے ایک سبق آموز نظم)

پہلی لغزش

(اساطیرِ نسواں کا نازک ترین سانحہ)

وادی چھلک رہی تھی رعنا شگفتگی سے
اور صبح کی شفق تھی جھلمل دوشیزگی سے
شبنم مچل رہی تھی ندی کے ہر کنول پر
موتی ٹپک رہے تھے ہر گُل کی پنکھڑی سے
کچھ بھینی بھینی خوشبو جھونکوں میں بس رہی تھی
چمپا، گلاب، جوہی، سنگار، سیوتی سے
گُلفام بادلوں کے نرم اور دبیز گالے
انگڑائی لے رہے تھے شب کی غنودگی سے

اِک جھیل کے پکھیرو جاں بخش جھٹپٹے میں
اُڑتے تھے تیرتے تھے اپنی سُبک پری سے
یُوں نزہتِ سحر سے نکھری ہوئی تھی ہر شے
مشّاطگی عیاں تھی موسم کی تازگی سے
اِک گوشۂ خنک پر الماس جھولتے تھے
فوّارۂ رواں کے رشحاتِ سرمدی سے
گلہائے یاسمیں کی مہکی ہوئی گپھا میں
حوّا لبھا رہی تھی آدم کو دلبری سے
لوچ اور لچک کی پُتلی یعنی وہ پہلی عورت
راز و نیاز میں گُم ہمگفتگو تھی پی سے
تسنیم و کوثر اس کی چُوری سے منفعل تھے
جو کیف چھپا رہا تھا آوازِ نقرئی سے
پنہاں تھی وہ لطافت اُس کے لب و گلو میں
پیدا تھی یوں نزاکت لہجے کی کپکپی سے

جس طرح مطربہ کے اک ساز چھیڑنے پر
نغمے سے تھرتھرائیں تاروں کی تھرتھری سے
تھی بار جن لبوں پر افزائشِ تبسّم
وہ لب یہ کہہ رہے تھے اک شستہ نازکی سے:
"اب تک تو اس فضا کی گلگشتِ منتشر میں
تم روکتے رہے ہو رجحانِ خودروی سے
کیوں میرے رقص و رم پر پابندیاں ہیں ایسی؟
تم مرد ہو تو کیا میں کچھ کم ہوں ہمسری سے؟
گنجانِ برگ و بر کی گلپوش وادیوں میں
جانے دو مجکو تنہا، آج اپنی ہی خوشی سے
شادابیوں میں جیسے اک سروِ ہو خراماں
رفتار کافری سے، نیرنگِ دلکشی سے،
مجھ کو یونہی چمن میں آزاد گھومنے دو
کوئی یہاں نہیں ہے مجھکو نگی کیا کسی سے"

آدم یہ بات سُن کر محویتوں سے چونکا
نازک تھی یہ جدائی نازک تریں کلی سے
اس کو نہ تھی گوارا حوّا کی سیرِ تنہا
وہ خوب آشنا تھا شیطاں کی دشمنی سے
سوچا جواب اُس نے کچھ دِل ہی دِل میں اپنے
ناخواستہ کہا پھر اس غیرتِ پری سے:
"اے میرے دِل کی ملکہ! اگر مانتی نہیں تو
شفقت سے، مشورے سے، مِنّت سے، عاجزی سے
تسلیم تیرے دِل کی یہ آرزوئے رنگیں
جا سیر کر اکیلی، خود اپنی رہبری سے
لیکن ذرا سنبھل کر، اِک دشمن آڑ میں ہے،
دھوکا نہ کوئی کھانا اُس کی فسونگری سے"
منوا کے بات اپنی بیتاب نازنیں نے
چُٹکی سی ایک کاٹی پلکوں کی ساحری سے!

اور پاسے رنجہ فرما سوئے روش اُٹھا کر

چلتے ہوئے کہا یہ دم سازِ زندگی سے :

"اب جا کے دوپہر تک لوٹ آؤنگی سلامت

باور کر دیہ وعدہ آسودہ خاطری سے"

اس وقت کیا پتہ تھا اس کو کہ لوٹنے تک

وہ "وہ" نہیں رہیگی کس چیز کی کمی سے

پیمانِ واپسی تو یوں باندھتی چلی وہ

پر کتنی بے خبر تھی خود شانِ واپسی سے!

اِک دوسرے سے دونوں میلوں ہی دُور تھے اب

تھوڑا سا فاصلہ تھا گو قربِ ظاہری سے!

اِک سمت گل کترتی وہ جا رہی تھی لیکن

مُڑ مُڑ کے دیکھتی تھی معصوم سادگی سے

اُس کو کشاں کشاں اب لُٹوانے کے لئے یوں

لیجا رہی تھی قسمت اِک طرفہ بے بسی سے

اَلھڑ مسافرہ کو اُس بھیل کی کیا خبر تھی

پایا جو چل کے آگے اُفعی کی آشتی سے

کاش! اِک سبک پھریری پیکر کوئی گلہری

رستے میں آنکلتی خودرَو رَوا رَوی سے

اور یُوں پکار اُٹھتی گویائی ساری اُس کی:

"ظالم! بھٹک رہی ہے تُو راہِ راستی سے

کتنی لطیف نسلیں تیری رگوں کے اندر

برباد ہو رہی ہیں اِک تیری کج رَوی سے

تیرے جگر کے پارے اور دِل کے لختِ پیارے

صد چاک ہیں اَری او بیگانہ وش! تُجھی سے

زخم اُن کے تازہ ہونگے ہر نوبہارِ غم پر

سر اُن کے خم رہیں گے دائم ستمکشی سے"

عورت مگر تھی عورت "روبٹ"[1] نہ تھی وہ لُعبت

خودکار کیا سنبھلتی، مجبوریٔ خودی سے

[1] مصنوعی انسان (Robot)

ہونا ہی تھا ہوا جو، جانا ہی تھا اُسے تو
اِک تیرہ خاکداں میں اپنی فتادگی سے
عزّت، بہشت، رفعت، معصومیّت، شرافت،
کھویا گیا نہ کیا کچھ رخصت کی اُس گھڑی سے
پیراہنِ سماوی وہ حُلّۂ بہشتی،
چھن کر رہا بالآخر تحریصِ چاشنی سے
غم، انتشار، ذلّت، رسوائی، موت، لعنت،
پائیں سزائیں کیا کیا، پل بھر کی بیخودی سے
اُف کس قدر اہم تھا وہ سانحہ ذرا سا
ٹوٹیں بلائیں ساری انسان پر جبھی سے

(۱۵ مارچ ۱۹۳۴ء) قلمکار (۲۱ مارچ ۳۴ء)

کہاں سے کہاں!

میں اپنے جھونپڑے میں ایک دن خاموش بیٹھا تھا
خیالوں کے گھنیرے سائے میں روپوش بیٹھا تھا
دھری تھی سامنے میز، اس پہ کچھ خط اور کاغذ تھے
پریشانی میں بے ترتیب اُلجھے اور بکھرے سے
میں چُپکے چُپکے روتا تھا مسلمانوں کی حالت پر
خموشی اک "نوحہ" سا پڑھتا تھا انجامِ جہالت پر
نہ پایا تھا میں رقّت کے تغیر سے ابھی رہنے
کہا آہستہ سے مجھکو یہ میرے غمزدہ دل نے:
"قلم کو جنبشِ تسلیم سے کاغذ پہ خم کر دے
جو غم کرنا ہے کم تجھکو، غمِ پنہاں رقم کر دے"
میں گویا چھیڑ ہی کا منتظر تھا سوگواری میں
یکایک ہو گیا یوں محو کیفیت نگاری میں:

غمِ پنہاں کہوں تو کیا کہوں عالم دگرگوں ہے
مجھے در پیش "اگر گویم زباں سوزد" کا مضموں ہے
کسی بیکس کا یہ کہنا کہ میں اب سے مسلماں ہوں
یہ کہنے کے برابر ہے کہ سمجھو تم مجھے مجنوں!
مسلمانی کا دعوے مدّعی کے حق میں شامت ہے
نگاہِ دہر میں ناقابلِ بخشش "حماقت" ہے!
یہ دعوت ہے مزاحی قہقہوں کے ہمنواؤں کو
ہنسی کی، دل لگی کی، خیرہ چشمی کی صداؤں کو!
طرح ہے دوستوں اور رشتہ داروں کو کنارے کی
ضدِ احباب و اعزّہ کے دلاسے اور سہارے کی
بلاؤں کے درِ خاموش کو خود کھٹکھٹانا ہے
سپر کو پھینک کر سوئے ہوئے فتنے جگانا ہے!
خود اپنے عزم مجبوری سے یوں مجبور ہو جانا
کہ اہلِ دہر کی رسمی مدد سے دور ہو جانا!

مُسلماں جس طرح نیرنگیٔ قسمت پہ ہے روتا
کوئی مُجرم سے مُجرم بھی پشیماں یُوں نہیں ہوتا!
بدی یُوں غالب آئی ہے زمانے میں بھلائی پر
مرے جاتے ہیں دُنیا دار اُس کی خوشنمائی پر!
بُرائی سے کہیں بدنام ہے اب نام اچھائی کا
کرشمہ ہے یہ اِس دُنیا کی کافر ماجرائی کا!
وہی دنیائے صد پہلو ہزاروں رنگ ہیں جس کے
ہزاروں پینترے ہیں اور ہزاروں ڈھنگ ہیں جس کے
وہی دُنیا ہے جس میں وضع داری کی عملداری
وہی دُنیا پڑی ہے جس کی گھُٹّی میں ریاکاری!
وہی دنیا کہ جس میں بھیڑ چال انسان بستے ہیں
ندامت سے بھرے آدم نما حیوان بستے ہیں!
وہی دُنیا ہے جس میں وہ مسجّع داڑھیوں والے
بکارِ خویش، چوکس، چُست، اور چالاک متوالے!

بظاہر دیکھنے میں گرچہ ڈاڑھے ٹھوس ہوتے ہیں
کبھی پالا جو پڑ جائے چھپے جاسوس ہوتے ہیں
جو فیضِ عام کے ظرف وضو بھی بیچ سکتے ہیں
سرے سے آیۂ "لا تشتروُا" ہی بیچ سکتے ہیں!
وہی دُنیا ہزاروں جس میں مصلح اور شاعر ہیں
مگر دردِ نہاں کی چارہ فرمائی سے قاصر ہیں!
عبور ایسا ہے ان کو گرچہ خاموں اور زبانوں پر
زمینوں کو بٹھا سکتے تو ہیں وہ آسمانوں پر!
مگر جب سر بکف آتا ہے اِک اللہ کا بندہ
شہادت کی طرف آتا ہے اِک اللہ کا بندہ
تو یُوں بیگانہ اور انجان بن جاتے ہیں یہ گُمرہ
تغافل کوش اور نادان بن جاتے ہیں یہ گُمرہ
چھوئی تک بھی نہیں گویا انھیں تہذیبِ انسانی
سراپا جہل و نادانی ہے ان کا ذوقِ وجدانی!

وہیں، ہاں، جس جگہ ہیں عام رِیتیں دِل لگانے کی
نہیں کچھ قدر دانی عشق کے پاکیزہ جذبے کی
سمجھ سکتے نہیں اِنسان رسمِ عاشقانہ کو
رَسن کو، دار کو، تیشے کو، ضربِ والہانہ کو!
کہیں اِک کوہکن جب جانِ "شیریں" سے گزرتا ہے
رگِ ہستی پر اپنی مار کر خود تیشہ مرتا ہے
تو "جیوری" فیصلہ دیتی ہے: ظاہر ہے قصور اُس کا
فنا تک لے گیا "مجرم" (؟) کو خود "ذہنی فتور" (؟) اُس کا [1]
وہ دُنیا مادّیت کیش ہیں جس کے مکیں اب تک
حیات و زیست کے معنی کو پہنچے ہی نہیں اب تک
وہ کیا جانیں بہائے جاں بڑھاتے یا گھٹاتے ہیں
جب اپنی زندگی اور موت کے نیچے کراتے ہیں

---

[1] Unsound mind

وہی دنیا جو یکسر اک قمار آبادِ ہستی ہے
جہاں جینے کی بازی جیتنے کو جاں ترستی ہے
بجا ہے جہاں ستّھوں[۵۲] سیہ خانے کو جو سمجھو
جوئے کی جھولیوں کے جُل سے مونٹی کار لو سمجھو
وہی دنیا کہ غلّے سے بھرے بازار ہیں جس میں
اناج اور تازہ پھل انبار در انبار ہیں جس میں
اسی میں ہاں اسی میں بدنصیب ایسے بھی بستے ہیں
جو بھوکے اور پیاسے ہیں جو روٹی کو ترستے ہیں
انھیں بازاروں کے اندر جو پوشاکوں سے ہیں مملو
عوام اکثر گذرتے ہیں پھٹے کپڑوں میں گو درگو
وہی دنیا کہ جس کا انحصار اصلی روپے پر ہے
جہاں تعظیم و استعداد کا معیار ہی زر ہے

---

۵۲ Sweep-stakes

وہی دُنیا جہاں وہ لوگ مالا مال ہوتے ہیں
جو چوروں اور ٹھگوں سے بھی گُرو گھنٹال ہوتے ہیں
لیا جاتا یہ مطلب جہاں وضعِ تجارت سے
کہ لوٹا جائے گاہک کو ہر اِک ممکن "حفاظت" سے
وہی رشوت زدہ شعبے جہاں راشی ہی راشی ہیں
جہاں کے محکموں میں سب شریکِ بدمعاشی ہیں
وہی جس میں روا وہ ناروا قانون ہوتا ہے
اُصولِ عدلِ انسانی کا جس سے خُون ہوتا ہے
مدارِ انصاف کا ہے جس جگہ جعلی گواہی پر
دھرے جاتے ہیں معصوم اپنی ناکردہ گناہی پر
جس آبادی میں عدلِ دادرس ننگِ عدالت ہے
جہاں بازیگری شاطر وکیلوں کی : کارت ہے!
وہی دُنیا جو جھوٹی خیر خواہی کے بہانے سے
نہیں شرماتی سادہ لوح جانوں کو مٹانے سے

وہی جس نے ہمیشہ باوفا سے بے وفائی کی
ادا پائی ہے جس نے ابتدا سے بیسوائی کی!
وہی جس نے رکھا غالب شریفوں پر شریروں کو
کیا پیوست جس نے باصفا سینوں میں تیروں کو
وہی جو تاک میں رہتی ہے روبہ کی طرح ہر دم
جو غافل ہو ذرا انساں تو ہو جائے شکارِ غم!
وہ دُنیا جس میں ایسے بھی ہیں بُغض اور کینہ کے پُتلے
بنا رکھتے ہیں جب ہم شکلِ اعدا گُڈیاں گُڈّے!
پرو کر سُوئیاں اور برچھیاں آغوش و گردن میں
سُلا دیتے ہیں گہری نیند ان کو مہدِ مدفن میں!
وہی دُنیا، جہاں عام اِس سے یا اُس سے کوئی جا ہو
کہیں بھولے سے جا نکلو تو ارضِ لُد کا نقشا ہو
وہی دُنیا کہ جس کے شہر گُمراہی کے مسکن ہیں
رذالت کے، سفاہت کے، دنائت کے نشیمن ہیں

دماغ اور دل ہیں اربابِ تمدّن کے یونہی غلطاں
گئیں ہیں جس طرح شہروں میں "تنگ اور خم بہ خم گلیاں
وہی جس میں کہ اُن بہروپیوں کے خیمے ڈیرے ہیں
جو باتوں میں مہذّب ہیں جو گھاتوں میں لٹیرے ہیں
بنے پھرتے ہیں جو تہذیب اور فیشن کے پرکالے
مری آنکھوں سے دیکھو کیا ہیں یہ شائستگی والے
نشاناتِ خباثت ہیں یہ سب جسمِ تمدّن پر
اُبھر آیا ہے فاسد خون پھوڑے پھنسیاں بن کر
وہ دُنیا جس میں عیّاری کے سائے ڈھلتے پھرتے ہیں
سراپا چار سو بیس آتے جاتے، چلتے پھرتے ہیں!
وہی دنیائے خونیں جس میں وہ خونخوار چیتے ہیں
جو ننگِ نسلِ انسانی ہیں، خنزیر اور چیتے ہیں!
وہ دیواریں کہ جن کے سائے میں ہے وہ نہاں کاری
چھپائے ہے جسے خشت اور گِل کی چار دیواری!

اگر گتے ہی ہوں سب اور سے گتے ہی کا ہر در ہو
بجائے سقف چوب پختہ گتے ہی کی چادر ہو!
پھر ان کو نقل و حرکت کے لیے موزوں جو ہم پائیں
تھیاتر کے مناظر کی طرح آہستہ سرکائیں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے وہ نظارہ کیسا ہو؟
مرا دل تو یہ کہتا ہے وہاں ایسا تماشا ہو
کہ جیسے اُس جگہ جس میں برہنہ سب لفنگے ہوں
کسی حمام کے اندر تمام افراد ننگے ہوں!
وہی دنیا جہاں کے لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں
اگرچہ رات دن کتوں سے بدتر موت مرتے ہیں!
غلیظ اتنی ہے ذہنیت مدیرانِ صحائف کی
کہ ہر اخبار کا دفتر دوکاں ہے اِک طوائف کی
وہ دُنیا جس میں ہے چینیائی پینک کی ترنگ ابتک
چرس کوکین، دارو، سُلفہ، [illegible]، پوست، بھنگ ابتک

وہی کُتّے کی دُم جس کے نکالنے سے نہ نکلے بَل

وہی بے ڈھب تمنر جس کی نہیں کوئی بھی سیدھی کَل

وہ جس کو اپنی ہٹ اور ضد کی اتنی لاج اور پچ ہے

ہو گر جھوٹی بھی بات اس کی تو کہتی ہے نہیں سچ ہے

خود اُس پر ایک بھاری بوجھ ہیں گرچہ رواج اُس کے

مگر انجام پاتے ہیں انھیں سے کام کاج اُس کے

وہ جس میں کچھ پنپنے کی نہ کچھ نبھنے کی باتیں ہیں

جو ہیں تو کیا ہیں؟ نسلیں اور ذاتیں اور پاتیں ہیں

جہاں ابنائے آدم پر "لیبل" صورت آرا ہیں

یہ نوکر ہے وہ "سٹر" ہیں، یہ بندہ ہے وہ آقا ہیں!

یہ قبلہ ہیں وہ کعبہ ہیں، یہ حضرت ہیں، وہ علامہ

یہ خواجہ ہیں وہ مرزا ہیں، یہ حاجی ہیں وہ مولانا!

سیہ ہیں جن کے سینے جو سراسر کور باطن ہیں

نئی تہذیب کی محفل میں وہ افراد روشن ہیں!

جو ہیں اس ہیکلِ ظلمت میں چند اک روشنی والے
وہ کہلاتے ہیں بیگانوں کی تعزیرات میں "کالے"
وہ جس پر غلبہ طاری ہیبتِ برگستواں تک ہے
نمودِ دیرپا تاب و توانِ استخواں تک ہے
وہی ناکام دُنیا جس میں بعد از کوشش و کاوش
کہیں بھولے سے بر آتی بھی ہے دِل کی اگر خواہش
تو کس وقت؟ آرزو کی جبکہ پروا ہی نہیں رہتی
تمنائی کے دل میں وہ تمنا ہی نہیں رہتی
وہی، جس میں خزف ریزوں سے بدتر ہیں جو بے جوہر
فریبِ ارجمندی سے ہیں فائق لعل و گوہر پر!
وہ جس میں جیتے جی حقدار کی عزت نہیں ہوتی
عزیز و دوست کو تحسین کی ہمت نہیں ہوتی
مگر لوگوں سے اٹھ جاتا ہے جب سرگشتۂ حسرت
تو سب کرتے ہیں ماتم گاڑ کر جھنڈا سرِ تربت!

منائے جاتے ہیں پھر عُرس کے تہوار میلوں سے
جمائے جاتے ہیں رونق کے رنگ اس پر جھمیلوں سے
وہی دُنیا جو ہم سے کھیلتی ہے، مُسکراتی ہے
لپٹتی ہے، جھپٹتی ہے، مچلتی ہے، لُبھاتی ہے!
تھرکتی ہے، اُچکتی ہے، اُچٹتی اور لچتی ہے
ٹھُمکتی ہے، چٹکتی ہے، لچکتی ہے، چھلکتی ہے!
سکڑتی، پھیلتی، دبتی، اُبھرتی، اور بَل کھاتی
اکڑتی، اینٹھتی، تنتی، جھپٹتی اور غُرّاتی!
اُمڈتی، اینڈتی، بڑھتی، لپکتی، دندناتی ہے
لُڑھکتی، رینگتی، گِرتی، سِسکتی، سنسناتی ہے!
وہی کشتی جو لڑتی ہے خیالی خام پشتوں سے
گری ہے رستم و سہراب کی گمنام پشتوں سے!
وہی تو دیکھنے میں دلفریب اور خوبصورت ہے
تہِ سطحِ ملمّع بدنما ہے زشت سیرت ہے!

وہی جس کو سمجھ چکنے کے بعد آخر یہی پایا

کہ "کس نکشود و نکشائد بہ حکمت ایں معمّہ را"

وہی پُر سحر دُنیا جو سفنکس[1] سا اچنبھا ہے

پُر اسراری میں زندہ چیستاں کا اِک ہیولیٰ ہے

جو مایا ہے، جو دھوکا ہے، چھلاوا ہے زسر تا پا

وہی بُڑھیا، وہی جادو کی پُڑیا، ہاں وہی دُنیا!

جو اصلیت ہے کچھ اس جا تو ہے رسمی روایاتی

عمل میں کونسی مکروہ شے ورنہ نہیں آتی!

تمیزِ این و آں کیا؟ ہے حقیقت بھی مجاز اَب تو

نہیں دونوں میں ہو سکتا کوئی بھی امتیاز اَب تو

اگر پہچان ہے اب بھی تو اُلٹی ہے مثال اُس کی

اثر سے مسخ ہے ہر چند شکلِ خط و خال اُس کی

---

[1] Sphinx

مجاز و اصل میں ہے کار فرما ایسی نیرنگی
کہ جس کا نام ہے "کافور" اغلب ہے وہ ہو "زنگی"
یہ بوالعجبی بھی گر مقیاسِ حیرت ہو نہیں سکتی
مسلمانوں کو درس آموزِ عبرت ہو نہیں سکتی
تو بہتر ہے کہ بدلیں نام بھی خود بھی بدل جائیں
"تکلف برطرف اسلام سے باہر نکل جائیں"

یہیں تک لکھنے پایا تھا کہ یہ غیبی ندا آئی:

"سنبھال اپنا قلم او خامکارِ ناشکیبائی!
نہیں ممکن بشر سرِّ ازل، رازِ ابد جانے
وہ باہر پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی حد جانے
گذرنا ہو کسی کو گر حقیقت کے مراحل سے
تو کانٹوں میں وہ اپنے آبلوں کو اور اُلجھا دے
یہ دُنیا تُو نے جس کا چہرۂ تعبیر اُتارا ہے
بھیانک اور بھونڈا خاکۂ تصویر اُتارا ہے!

تری بینائیِ سطحی کی سطحِ خود نما تک ہے

کہ خط کش اس گھروندے کی تری ہی زشت عینک ہے

پڑا ہے اس کے چہرے پر جو نقص و عیب کا پردا

حجابِ کم نگاہی ہے تری کوتاہ نظروں کا!

بُرائی گر بُرائی ہے بُرائی کی بُرائی کیا؟

اچھائی گر اچھائی ہے اچھائی کی اچھائی کیا؟

بدی ہے گر بدی تو اُس کی ہے یہ فطرت و طینت

نکوئی گر نکوئی ہے تو ہے اس کی یہ خاصیت!

نہ بس ہے خیر کے عنصر کا اپنے بیش اور کم پر

نہ کر سکتا ہے شر اپنے کو خود کچھ کمتر و برتر

"تاثرِ برطرف" ہر کیش کی ہے سادہ کیفیت

بناتی ہے اُسے محمود و مذموم اس کی نوعیت!

نشاں گیرِ تناسب ہیں سبھی جتنی بھی راہیں ہیں

بھلائی اور بدی بھی نسبتی دو اصطلاحیں ہیں!

اگرچہ سب تاثر سے قیاسِ دہر کرتے ہیں
محرّک ہائے بیرونی پہ مبہم نام دھرتے ہیں

صدآئینہ ہے اِس ماحولِ رنگارنگ میں ہر شے
تجھے تو دیکھنا ہے تیرا اسلوبِ نگہ کیا ہے؟

ترا معیارِ کیف وکم تو پنہاں ہے ترے دل میں
تو اس کو رائگاں ڈھونڈا کیا دُنیا کی محفل میں!

بلا سے ماسوا دُنیا ہو زیبا یا ہو نازیبا
نہ لاخوبی کو خاطر میں نہ زشتی ہی کی کر پروا!

اُسے کرنے دے کام اُس کا، تو اپنا کام کرتا جا
مسلسل خدمتِ اسلام تا انجام کرتا جا!

گداز و سوز کے اِن مرحلوں کا دَور فانی ہے
کہ یہ دیباچۂ آں داستانِ جاودانی ہے!

(اوائل اپریل ۱۹۳۴ء)

قلمکار (۲۷ر اپریل ۳۴ء)

پودے کا روگ

پردیس میں یا جنگل ہوں تنہا
بتلاؤں کسے میں اپنی بپتا
دن رات دہیں پہ ہوں جہاں ہیں
پھیلا نہ بڑھا، پھلا نہ پھولا
بس ایک ہی رت ہے مجھ پہ طاری
اترا نہ جو رخت میں نے اوڑھا

اِس دھوپ کے رنگِ برگ سے ہوں
بیمار، نزار، زرد، روکھا
لہرائے کہیں جو اِس فضا پر
تو لاگ سے سُوکھ جائے جھالا
پتّوں کو مرے پتہ نہیں کچھ
کیسا ہے خنک ہوا کا پنکھا
اِک بوند بھی کی طلب جو میں نے
تو آنچ سے باغباں نے سینچا!
نس نس میں اِک آگ سی بھری ہے
ہر پور یہ ہے اسی کا لاسا[1]
ناسُور ہیں ہر اِک چمن کے ریشے
ناسور ہے میرے دِل سے رِستا

[1] درخت کا دودھ جو گوند بھی کہلاتا ہے۔

اوروں کے مسامِ شَل بھی شاداب
کونپل بھی مری بغل میں کانٹا
رسیائی ہوئی ہیں اُن کی کلیاں
مرجھائی ہوئی ہے میری کایا
بیلوں میں وہاں لہک ہے جیسے
اُے کاش! یونہی میں لہلہاتا
مہکی ہیں فضائیں جیسے اُن کی
یہ کُنج بھی اُس طرح مہکتا
دُور، آڑ میں، اُس لکیر کے پار
سُنتا ہوں کہیں اُدھر ہے برکھا
ایسا نہ ہوا کہ اِس طرف بھی
لے آئے صبا اُڑا کے چھینٹا
افسوس! کہ میری ڈالیوں پر
چہکا نہ کبھی کوئی پپیہا

پھلنے کو ترس گئیں یہ شاخیں

بھولے سے نہ آئی کوئی خاما

اس پر یہ ستم کہ خستگی میں

حسرت کا سماں ہے جبکہ چھایا

خواہاں ہے یہ خوشہ چیں کہ از خود

ہو جاؤں ہرا بھرا میں پیاسا!

یوں اپنے تیئں شگفتہ کر لوں

انبار ہوں برگ و بر کے پیدا

ٹپکاؤں میں جھولیوں میں اُسکی

جگ بھر کے پھل اور پھول اکیلا!

پودے ہیں کئی طرح کے یوں تو

بھاری ہے کوئی تو کوئی ہلکا

قلمی ہے کوئی تو کوئی بے رُت

کڑوا ہے کوئی، کوئی رسیلا

گلدان سے ہے کسی کو گر لاگ

تو راس نہیں کسی کو گملا

لنجا[ل] ہے کوئی، تو کوئی گنجان

روگی ہے کوئی، کوئی توانا

ہاں! یہ تو کہو کہ مجھ سے پہلے

دیکھا بھی سنا ہے کوئی پودا؟

(۵ مئی ۱۹۳۴ء)

مطبوعہ "ہمایوں" لاہور (۱۵ دسمبر ۱۹۳۴ء)

[ل] Crippled

رنگِ زر کا راز

(ماخوذ از سورۂ الحدید)

دہر میں ہے تکاثرِ الاموال[1]

وہ بھری برشگال یا برسات

جو فراوانیٔ ترشح سے

یوں شگفتہ کرے خلوص کی دھات

---

[1] وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ ......
کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ
ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرَاہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ
یَکُوْنُ حُطَامًا ۔ (قرآن حکیم)

کہ ہو دہقان، خورّم و شاداں

دیکھکر برگ و بار کی بہتات

سبز پھر زرد اور پھر خاشاک

ہے یہ ترتیبِ انقلابِ نبات

پڑ چکتے ہیں پہلے سے پیلے

زعفران زارِ زر کے پھول اور پات!

یہ نشاں ہے کہ اس کی شادابی

ہے سرابِ فسردگیٔ ممات!

کیا ہے دولت؟[۲] اک التزامِ وداع،

جو بنا ہی سے ہے تضادِ ثبات!

بتاریخ ۷ مئی سنہ ۱۹۳۴ء (غیر مطبوعہ)

---

[۲] دولت کے معنی ہی پلٹنے کے ہیں :

پنکھڑیاں

سزا جزا سے ورا، سُود اور زیاں سے سوا

"ملا کچھ اور ہی" وارفتۂ وفا کو صلہ!

چلی ہے طاقتِ غیب آزمانے میری کوشش کو

میں خود بھی آزماؤں گا ادائے آزمائش کو!

کد ہے اگر کسی سے تو رکھئے گا کد مگر

ضد میں نہ چھوڑیے گا خود اپنے اصول کو

نہ پوچھ حسرتِ واماندہ کی پشیمانی

ثواب مل نہ سکا اور گناہ کر نہ سکے!

رونقِ محفلِ جہاں سرکار رکھتی جان ہوں

اُن کی ٹھوڑی پہ نہ کیوں اہلِ نظر قربان ہوں!

والگا کی مرغابی[1]

اُڑتے اُڑتے کہاں پہ آ پہنچی
والگا سے چلی جو مُرغابی
طے کئے وہ گیاہ زارِ تخیل
مُسکراتی تھی جن میں شادابی
اور وہ وادیاں قہستانی
جھلملاتی تھی جن میں سیرابی
کہیں رستے میں اسکے جھیلیں تھیں
دھندلی، گمبھیر، نم بھی محرابی
کہیں گلشن قریب نخلستان
اور کہیں خطہ ہائے تہ آبی

[1] اس مرغابی کا نمبر ۱۷۵۲۰ تھا

شور کرتے تھے آبشار کہیں
تُند، طوفان خیز، سیلابی
کہیں ریگِ رواں کہیں دلدل
کہیں تال اور نشیب تالابی
کوہساروں سے یوں نکل آئی
جیسے پلکوں سے روحِ شب خوابی!
یا گھنی بدلیوں کے پردوں سے
تیز تارِ ضیائے مہتابی!
تک رہی ہیں کمند یاں اب تک
اُس سے رفتارِ پیکِ سیمابی!
یوں فراز اس کے سامنے تھے نگوں
گہری ندی میں جیسے پایابی!
اس کی پھرتی میں تابِ شاہینی
اس کے شہپر میں شانِ سرخابی!

تھی کشش جس طرف اُدھر آئی
کی نہ پرواز سے عناں تابی
شست بیکر شکار گیروں نے
فیر کرتے ہی جھٹ وہیں داابی!
کہیئے اس کو قضائے صید زبوں
یا غریب الوطن کی بیتابی!
جو گری بھی تو کس کنارے پر
یہ نصیب از نا لبط آ.ی!
چند در چند نسبتوں سے جسے
ہم سمجھتے ہیں ہند کی چابی!
دلِ پُر کارِ وادیٔ ستلج
قیس آبادِ عہد پنجابی!
کیا یہ بط ہے وہ طیرِ بادنما
جو ہو گردش پذیر گردابی؟

یا کسی دُور بیں کی تارِ نگاہ؟
یا نقیبِ طوافِ دولابی؟

کیا جزءِ ارضِ لُد اس کی راہ میں تھا
نہ کوئی اور گنجِ شادابی؟

"ٹاس"[1] ہے یا یہ قُرعہ اندازی؟
حل کریں جانشینِ فارابی

کہیں طیّاروں کی "طرح" تو نہیں
مشقِ پَر کی یہ سلسلہ یابی؟

پَر فشاں قافلے کے رُخ پہ نہ ہو
پیش رو، پَر شکستہ مُرغابی

ہاں! یہ ہے اس سحر کی پہلی شعاع
جس سے ہونے کو ہے افق تابی!

۹ جون ۱۹۳۴ء — (غیر مطبوعہ)

---

[1] ٹاس (Toss)

صلیب اور تاج

تین صلیبوں کی تمثیل!
جن کے نیچے استادہ مبہوت انسان!
کچھ شہری اور کچھ راہب اور کچھ ربّی[1] اور کچھ کاہن
دور پڑے ہیں خون آلودہ مصلوبوں کے پیراہن!
دو کھونٹوں پہ آویزاں ہیں دو چوروں کے عُریاں تن!
ان دونوں کے بیچ میں اک مجروح بدن
معصوم اور محروم کفن!

۱؎ Rabbi

اتنی صدیوں کے بعد آج
منتظر اس کے لوٹ آنے کی ہیں اقوام
چھائے جاتے ہیں دنیا پر اس کی آمد کے آثار!
جھوٹے دعوے تھے! گرہن، اور مظلوموں کی چیخ پکار
ساری قوموں کے ریشوں میں بنیاب آشوب پیکار
ہاں! گردوں سے اب آئے وہ ابر سوار!
اترے یزدانی اوتار!

آنے والا ہے وہ دَور

جب ہوگا آزادی کا اعلانِ جہاد

ابنِ آدم کر ڈالے گا شیطانی لشکر تاراج !

توڑے گا فرسودہ صلیبیں ! دیکھیگا اسلام کی لاج !

مہرِ عرب کی حلقہ بگوشی سے پائیگا طرّۂ تاج !

بیس برس تک پہنچیگا مہدی کا راج !

مشرق و مغرب میں بجینگے باج !

(٢٠ جون ١٩٣٤ء)

مطبوعہ جریدہ "تاج" ہفتہ وار (آگرہ)

؟

(١٤ فروری ١٩٣٥ء)

بنگال کا باغی شاعر

ایک سپاہی جاگ رہا ہے!
خندق میں سب اُس کے ساتھی خستۂ خواب،
تاریکی ہے، خاموشی ہے، سناٹا ہے اور میدان!
دن بھر جس کے دامن میں تھا گرم لڑائی کا گھمسان!
تیغوں تیروں کی جھنکاروں اور بوچھاروں کا طوفان!
اب شورش کے تھم جانے سے گورستان!
ویراں مرگھٹ یا شمشان!

چیخیں سی کچھ گونج رہی ہیں،
طیاروں سے پھینک رہے ہیں تیرِ شعاع!
فرشِ زمیں پر چھوڑ رہا ہے گولے کوئی بم انداز!
بندوقوں کے چل جانے کی یکلخت آتی ہے آواز!
اِک دو لمحے شور و شغب سا، پھر وہی خاموشی کا گداز!
پھر ظلمت کے بادل میں روپوش جہاز!
پھر وہی افسوں خواب نواز

دل ہے سپاہی کا بیتاب!
نیند اُس مضطر سے ہے کالے کوسوں دُور!
کروٹ کروٹ پہلو بدلے چین نہ پائے وہ بیدار!
جذبات اُس کے تیز لہو کی گردش سے غلطانِ فشار!
ایلو! نادانستہ اُس کے مُنہ سے ٹپکے چند شرار!
رزم افروز و ظلمت سوز وآتش بار!
انگاروں کی سُرخ بہار!

باغی شاعر کا آغاز!

جس کی بنگلہ ادب کے حلقوں میں ہے دھوم

جس کے ہر اک شعر میں غلطاں شعلۂ تیغِ خون آشام!

ہر بنگالی کے دل میں ہے کندہ جس کا خونیں نام!

کا دہ پرچم ہے ساونتوں کو جس کا پُر جوش پیام!

جس کے تلے ہیں دہقان و مزدورِ غلام!

آگئے خود نذر الاسلام[1]!

---

[1] بنگال کا انقلابی شاعر

آگ، لہو، کوندے کی لپک!

گونج رہا ہے رزم گہِ مشرق میں بگل!

بھک سے اُڑا دو، جھپٹو، کودو، گرجو، ہرچہ بادا باد!

مارو، مارو، دابو، دابو، استعمار و استبداد!

موت آئے اب یا آزادی، مرجائیں یا ہوں آزاد!

بھارت کی دقیانوسی شاعر برباد!

باغی شاعر زندہ باد!

۱۷ر جون سنہ ۱۹۳۴ء (غیر مطبوعہ)

فروغِ مشتِ خاک

(اِس نظم کا خیال ایک حد تک "جاوید نامہ" کے ایک ٹکڑے سے ماخوذ ہے)

ستاروں کی نگہ میں رشکِ رہِ خاک بے گوں ہوئی!
وہ جو پھٹنے کو ہے خواب اِسکی جب اُن سے فزوں ہوئی!
زمیں آزرائیگی تقدیر کے رخشندہ کوکب پر
یہ ضو در آستیں، خود ہی سپہرِ نیلگوں آئینگی
وہ شے جو پرورش پاتی ہے نہروں کی کشاکش میں
کسی دن گردِ آبِ نیلِ گرداں سے بروں ہوگی
اُلٹنے کو ہے پندارِ خرد کا تختۂ ساز ش
کہ اب عشقِ بلاکش کی دعا صرفِ جنوں ہوگی!
ارے او اہرمن جھک، اور نظر کر بختِ آدم پر
تو سمجھا تھا کہ اِس ذرّے کی قسمت واژگوں ہوگی؟

اُڑے گا تازہ شہپر سے یہ فردوسی فضاؤں میں
مگر پاداشِ عصیاں سے تری حالت زبوں ہوگی

بچا کر، ہاں! دکھا اپنے تئیں اب قعرِ آتش سے
یہ ٹھانی تھی نجاتِ انساں کی یوں ہوگی نہ یوں ہوگی؟

گرفتارِ صد افسوں کر چکا تو رُوحِ انساں کو
اسیر اب اِس کی سیرت سے تری رُوحِ فسوں ہوگی

ڈھلیگا ایسی موزونی سے اِس کا نیم رس مضموں
دلِ یزداں کی گہرائی اثر گیری سے خوں ہوگی!

(۲۵ جون ۱۹۳۴ء)

مطبوعہ روزنامہ "احسان" لاہور (۲۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء)



چندے کی وبا

قوم کو اور مرض ہے لالچ کا
جس سے طاری ہے عالمِ سکرات
وہ بھی نکلے علاج کے محتاج
جن سے تھی کل اُمیدِ اصلاحات
غرض آلودہ ہیں مرض سے ہنوز
چارہ سازوں کے نسخہ ہائے نجات
سُود لینا تو ہے حرام اُن کو
کیونکہ وہ تو ہے تحتِ ممنوعات
ہاں مگر اور جو بھی مل جائے
از رہِ قدردانیٔ خدمات
ہو چکی "نیشنل اکانومی"
بھیجئے عہدِ رفتہ پہ صلوات

چاہتے ہو جو خیریت اپنی
مولوی جی کو دیجیے خیرات

گھر میں کھانے کو گر نہیں تو نہ ہو
اُن کو لا دیجیے چرا کے زکات

تحفۂ شرمِ بے زری ہی سہی
لائیے کچھ تو بہرِ ماکولات

اُسے وہ تیز آب ہی کا جام سہی
پیش کیجیے برائے مشروبات

اُت رے ناخواندہ مہمانی کے
یہ عجیب و غریب مکروہات!

وہ ایمں ہیں امانتِ دل کے
جن کی چندے پہ ہے گذراوقات!

یہی مخصوص مد ہے جس میں سے
سب نکلتے ہیں اُن کے اخراجات

اسی چندے کی ٹکیوں کی طفیل

حاصل اُن کو ہیں نت نئی لذّات

انہی دیناروں کا ہے کاروبار

جس سے جاری ہیں اُن کی تفریحات

توند ہے اُن کی وہ گراں زنبیل

جذب ہو جائیں جس میں نیل و فرات

مُفت سے انتساب مُفتی کا

مستقل ایک بابِ "مُفتیّات"

زرِ نگل کے ڈکار بھی جو نہ لیں

کس طرح دیں سُراغِ موصولات

کس رقم کی رسید؟ کیسی رسید؟

آج تک کس نے دی رسیدِ زکات

کیوں وہ رکھّیں حساب چندے کا؟

سوءِ ظن سے بری ہے اُن کی ذات

ڈھول منصبی کا پیٹتے ہیں بہت

بند کر کے وہ خود ہی اخبارات

یوں سناتے ہیں "دردِ دل" سب سے

مشتعل ہوں عوام کے جذبات

اشک آنکھوں میں بھر کے شعلہ بیاں

اب بتاتے ہیں حسبِ حال آیات

بیکسوں سے بٹورتے ہیں پیسہ

نعمتِ زندگی ہیں ساری تحریکات

ان سے تعویذِ کیمپ لے لو

چاہتے ہو جو مفلسی سے نجات

ہر اسامی کے حق میں ہیں ہمدرد

ہر غنیمت کیے ز مغتنمات

وہ مگر ہتھکنڈے نہ چھوڑیں گے

گو لنگوٹی ہی آئے ان کے ہات

از برائے کو ہیں از الف تا ی

"واتقوا" کی تمام تفسیرات

فدیہ، نذرانہ، جزیہ، جرمانہ

سب ہیں "دیوالہ" ہی کی تعبیرات

"واقرضوا" "واشکروا" "حِجزات اللہ"

کیسے پاکیزہ ہیں یہ ارشادات!

زر پرستی یہ ناز بت شکنی

ماحیِ لات اور محیِ منات!

یہ ریاکار مذہبی قزاق

کیوں ہیں کیوں سب بے نیاز تعزیرات؟

دُرّے لگتے نہیں انہیں، افسوس!

کوڑے پڑتے نہیں انہیں، ہیہات!

بتاریخ ۷ مئی ۱۹۳۴ء (غیر مطبوعہ)

ساقی!

(کسی کیفے[۱] میں کیفِ موسیقی کے ساتھ)

پریمی نینوں سے مدھ بھر دے!
پینے والے پر رحم کر دے!

او سندر مانے والے ساقی!
زلفوں کو کچھ برہم کر دے!

---

۱ Cafe (ساقی گری کی کیف گاہ)

آہا! کیسی بدلی چھائی!
دیکھ! صبوحی کی رت لائی!
سے پینے دے متوارے ساقی!
بہکی بہکی برکھا آئی!

ایلو! مے کے قطرے ٹپکے
ٹپ ٹپ ڈھل کر اولے ٹپکے
یعنی ہلکے گالے ساقی!
مچلے، جھولے، ڈھلکے، ٹپکے

میری مستی تیری چتون!
تیری کاکل میرا ساون!
او نازوں کے پالے ساقی!
اُف رے تیرا اٹھتا جوبن!

ہوش اور حس کھو دے جوبن میں!
دونوں کو سمو دے جوبن میں!
موہن بھولے بھالے ساقی
آ! اور ڈبو دے جوبن میں!

کر مجھ کو مجھ سے بیگانہ!
دے پریم کا بھر کر پیمانہ!
مے برسانے والے ساقی!
شاداب رہے یہ میخانہ!

پریمی نینوں سے مدھ بھر دے
مدھ سے سلیقی کو جم کر دے
او شرمانے والے ساقی!
زلفوں کو کچھ برہم کر دے!

(۲۸ر جون ۳۴ء) (غیر مطبوعہ)

لطیفی سے

ذیل کے اشعار حیدرآباد (دکن) کے ایک نادیدہ کرم فرما مسٹر اختر موہانی نے (جن سے خاکسار کا ابتک براہ راست تعارف نہیں ہوا) غالباً میری نظم "عزم انگلستان" سے متاثر ہوکر سپرد قلم کئے تھے مختلف وجوہ کی بنا پر ابتک موصوف کا شکریہ ادا نہیں ہوسکا، یہ ان کا حسن ظن ہے، ورنہ "من آنم کہ من دانم"

تیرا وجودِ تابناک مایۂ نازشِ وطن
جوشِ عمل سے تیرا دل رشکِ ہزار کوہکن
تیرے ہر ایک فعل میں مصلحتیں ہزار ہیں
تیرا ہر ایک عزم ہے اوج فلک پہ خندہ زن

محفلِ شعر و شاعری تیرے ہی دم سے گرم ہے

تیری ہی ذات باعثِ رونقِ بزم و انجمن

تیری "لطیف شعریت" دلکشِ حسنِ کائنات

تیری "لطافتِ دماغ" روحِ بہارِ یاسمن

تیری "نگاہِ لطف" میں ذوقِ ادب کی شورشیں

تیرے حریمِ شوق میں علم کی شمع ضو فگن

تیرے بلند حوصلے تیرے جوان ولولے

مُردہ دلانِ رزم کو دیتے ہیں درسِ آہنی

نوٹ :- اس نظم کے آخری دو شعر ایک دعا کے حامل تھے جو مستجاب ہو چکی چونکہ ان کا تعلق ایک خاص موقع سے تھا لہٰذا دوبارہ شائع کرنیکی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

مطبوعہ "خیالستان" لاہور (دسمبر ۳۰ء)
مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۰ جون ۳۲ء)

نوائے تہنیت

ذیل کی دلپذیر نظم چند در چند وجوہ کی بنا پر اب تک غیر مطبوعہ رہی خاکسار تک حضرت اختر شیرانی کی وساطت سے پہنچی تھی، یہ نظم میرے لاہور کے رفیق تعلیم (کلاس فیلو) جناب سیّد محمد جعفری صاحب ایچ۔پی، بی۔ایس سی، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل نے میری یورپ سے مراجعت کے موقع پر تحریر فرمائی تھی، میں جعفری صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور اس امر کو اپنے لئے باعث صد افتخار تصوّر کرتا ہوں کہ "نوائے تہنیت" کا مصنّف ایسا قابل انشاپرداز اور فصیح مقرّر ہے۔ جس نے گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ میں اردو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں ہمیشہ فرسٹ پرائز حاصل کیا، ———— (ل)

آئی ہے صبا آج عجب راہ گذر سے
مدارز مسرّت کے ٹپکتے ہیں خبر سے
کیوں بلبلیں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں چمن میں
ہاں کونسا مژدہ ملا برگِ گلِ تر سے
اے ہمنفسو کیا ہے؟ کہ ہو وقفِ مسرّت
وہ آ گیا کیا لوٹ کے یورپ کے سفر سے
کیا سچ ہے کہ وہ یارِ سفر کردہ پھر آیا
اتنی نہ توقع تھی دعاؤں کے اثر سے
اے نکہتِ گل غنچۂ سربستہ سے کہدے
"کھل جا کہ جواں ہو گیا عالم نئے سر سے"
مستانِ خمِ آشام سے کہدے کہ پئے جائیں
کہہ ابرِ بہاری سے کہ جی کھول کے برسے
اے جعفری اے مستِ صبوحیٔ محبّت
کر تہنیتیں پیش دل و جان و جگر سے

ہے کون جو ہو تجھ سا تہِ گنبدِ افلاک
لے بڑھ گیا طالع ترا شمس اور قمر سے

پھر مشغلِ دیرینۂ اربابِ محبت
دامن کشِ دل ہو گئی "لطیفی" کے اثر سے

اللہ رے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم
کانوں میں صدا آتی ہے دیوار سے در سے

"اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے"

مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ (۱۲ر اگست ۳۲ء)



سہرا

بتقریب شادی خانہ آبادی میاں محمد حسن صاحب
لطیفی خلف الصدق میاں محمد شاہ صاحب مرحوم

(از عارف، نذیر، رفیق وغیرہم)

م مرحبا یُمن وسعادت کا ترے سر سہرا
ل لے بندھا آج لطیفی یہ معطر سہرا
م ماہِ پرنور کے ہے گردِ ہجوم انجم
ط طُرّہ دستار پہ پھبتا ہے تو رُخ پر سہرا
ح حُسن افروز ہے اس محفلِ عشرت میں حسن
ی یوں چمک اُٹھا ترا آج مقدر سہرا

(س) سیمِ گلہائے شگفتہ ہے حریفِ تسنیم
ن فیضِ نگہت میں ہے صد غیرتِ کوثر سہرا
(ن) نُور کی کرنوں میں ہیں خلدِ بریں کی کلیاں
ی یُوں کسی حُور نے گوندھا ہے معنبر سہرا
ہم بھی کچھ پھول عقیدت کے پرو لائے ہیں
لائیگا ایسا کہاں سے کوئی کیونکر سہرا

میاں محمد حسن

لطیفی

(قلمکار (نومبر ۳۲ء)



غائبانہ یاد

حضرت اختر شیرانی کی ایک بیاض کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر سے ذیل کے دو شعر گذرے جو انھوں نے میرے یورپ چلے جانے کے بعد میری نسبت لکھے تھے۔ قارئین کے ملاحظہ کے لئے اختر صاحب کی اجازت کے بغیر ان اشعار کو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں ------- لطیفی

تپشِ ذوق نے برسوں تجھے بیتاب رکھا
دِن کو بیچین رکھا، رات کو بے خواب رکھا

شعلہ کی طرح بھڑکتے تھے خیالات ترے
لیگئے جانب مغرب تجھے جذبات ترے

(مطبوعہ جریدۂ "مطالعہ" لدھیانہ ۵ ر اگست ۳۲ء)

جوانی کی ہوا

دلِ بیباک میں ایسی شعاعیں مسکراتی ہیں
جو زیرِ لب ہنسی دشوار خطروں کی اُڑاتی ہیں
بدل سکتی ہیں سنگیں موت کو جو خوابِ شیریں سے
رسن اور دار میں جو بے خطر جھولے جھلاتی ہیں!
سموتی ہیں ترنّم میں جو غم آشام نالوں کو
جو رنگیں قہقہے بن کر کراہوں میں سماتی ہیں!
بھری ہے وہ رجائیت جوانی کے رگ و پے میں
کہ نریادیں بھی اس کی جانفزا تانیں سُناتی ہیں
نویدِ تہنیت ہے سوگواری اُس خموشی کی
جب اشکِ غم چکاں کی تہ میں خوشیاں جھلملاتی ہیں!
کہیں آراستہ پیراستہ آئینہ خانوں میں
نسائی ندرتیں ذوقِ نظر کو آزماتی ہیں

لعب گاہوں پہ، لوناپارکوں میں اور "لیڈو" پر
نگاریں پیکروں کی بے حجابی سے لبھاتی ہیں
کہیں آسودۂ شب رُوماں کی لہریں پرنیاں ہوکر
گہے رزم معرکوں میں رزمیہ جوہر دکھاتی ہیں!
عناں گیری کے پُشتے چیر کر عزمِ تہوّر سے
مہیب اور دیو ہیکل موت سے پنجے لڑاتی ہیں
مقدّس ہے وہ رزم آرا جوانی وہ جوانمردی
شکستیں جس کو فیروزی کا زرّیں تاج اڑھاتی ہیں
گذرتا ہے نو آموزِ جوانی جب کشاکش سے
تو اس کو ذلّتیں آدابِ خودداری سکھاتی ہیں!
پہنتا ہے وفا کے جُرم پر جب عشق ہتھکڑیاں
تو پریاں ہلکے ہلکے برگ ہائے گُل گراتی ہیں!
جوانی گُم شدہ وادی ہے ان گُلفام پریوں کی
جو عاشق کو کفِ تلخابہ سے امرت پلاتی ہیں!

ملہ ایک نوع کے مینا بازار

جوانی کے سمندِ طبع پر مہمیز ہے وہ غم
رگوں میں جس کی ٹیسیں کربِ جاں سے خشر[1] اٹھاتی ہیں!
شکستِ پر میں مضمر ہے جوانی کی پر افشانی
کہ پرواں اس کی شاہینی کو پر چینیاں چڑھاتی ہیں
جوانی پر کچھ ایسی دلکشی منڈلائی رہتی ہے
بلائیں بھی جو آتی ہیں تو دِل کش بن کر آتی ہیں!
جوانی کو شباب اُس وقت کہنا چاہیے جس دم
سزائیں جُرم کی شوقِ عناں تابی بڑھاتی ہیں!
جوانی جب اُلٹتی ہے نظامِ کُہنہ کا تختہ
تو اس کی شورشیں طوفاں پہ طوفاں لائے جاتی ہیں!
جوانی کو ملیں وہ حکمتیں مُعجز نمائی کی،
جو بے سامانیوں ہی سے سر و ساماں بناتی ہیں!
جب اس کی روح بہنے کیلئے بیتاب ہوتی ہے
سوادِ تشنگی میں جو شُبارِیں گدگُداتی ہیں!

[1] خار دار رکاوٹیں

جوانی جب چھلکنا چاہتی ہے تنگناؤں سے
تو اس کی خشکیاں تسنیم کے سوتے بہاتی ہیں!

کرم فرمائی پر آتی ہیں فاقہ مستیاں اس کی
تو سلطان و گدا کو میزباں بن کر بلاتی ہیں!

گرانمایہ جوانی اس پہ یہ ارزاں فراوانی
کہ تیز اڑتی ہوئی گھڑیاں سرِ راہے لٹاتی ہیں!

کس آشفتہ نفس کی غمگساری ہے ہواؤں میں
جلاوطنی میں بھی خاکِ وطن کی گرد لاتی ہیں!

جوانی ماند پڑ جاتی ہے جب دل کی تباہی سے
تو اس کی عبرتوں میں ضو کی شمعیں جگمگاتی ہیں!

جوانمرگی کی بربادی میں پنہاں وہ ہلاکت ہے
کہ جس سے بجلیاں بھی کانپتی ہیں تھرتھراتی ہیں!

جوانی راکھ ہو جاتی ہے جب سوزِ محبت سے
تو اس کے کھنڈروں میں عظمتیں عالم بساتی ہیں!

رفو کوش اور نسیاں کیش رفتارِ تغیّر سے
جوانی کی خراشیں لذّتِ جاوید پاتی ہیں!
ہر اِک شے بھولتا ہے مُندمل کرتا ہے وقت آخر
مگر یہ کاوشیں نا آشنائے بے ثباتی ہیں!
دبا سکتی نہیں وہ یورشیں ردِ غبار اس کا
جوانی کی روانی کو جو مٹّی میں ملاتی ہیں!

(۱۷ ستمبر ۱۹۳۴ء)

قلم کار (۲۱ جنوری ۳۵ء)



نابغہ

(GENIUS)

فطرتِ جمیل کا معجزہ ہے نابغہ
اُس کی اِک نوازشِ نادرہ ہے نابغہ

پہلے پہل مُبہم و خام و نازک و خُنک
ایک استعارۂ صبحگہ ہے نابغہ

محرمِ صلاحیت خود بھی وہ نہیں ہنوز
تہ نشین اِک درِ گم شُدہ ہے نابغہ

اس کا ذہن اجنبی اس کی فکر اچھوتی سی
عامیوں میں ایک شئے مُہملہ ہے نابغہ

امتزاج و ساز سے فصل و امتیاز سے
رفتہ رفتہ ہستیٔ معرفہ ہے نابغہ

آخر ایک دِن کسی تازہ شاہکار سے
شاد کامِ دادِ بے ساختہ ہے نابغہ
شہر شہر، دِہ بہ دِہ، شرق و غرب، دور و نزد
نازشِ زمانۂ مشیفتہ ہے نابغہ!
اس کی سطرِ جستہ بھی موتیوں کی اک لڑی
حُسن کارِ طلعتِ ناطمہ ہے نابغہ
جس کی تازہ پتّیاں ہیں بیاض در بیاض
وہ خموش قوتِ نامیہ ہے نابغہ
طُرفہ گُل کُتر رہی ہے خرام خوش کی موج
محملِ بہار کا کوکبہ ہے نابغہ
رنگ و بُوئے عُنفواں، پرّہ بند کارواں
اور پیش خوشۂ قافلہ ہے نابغہ
جو بہے تو بیکراں اور ڈھلے تو جاوداں
وہ عجیب لمحۂ فکریہ ہے نابغہ

معرفت کی روشنی ہے اسی سے منجلی

بینشِ قلوب کا تزکیہ ہے نابغہ

جو رفو کرے عمق، چاک ہی کے ساتھ ساتھ

رَفرَفِ لطیف کی وہ نگہ ہے نابغہ

سر بمہر بھید کا جو سُنا ہے یہ نچوڑ

عطر ہائے روح کا شمامہ ہے نابغہ

اس کی لرزشوں میں ہے حسِّ جذب بس شناس

حُسن اور عشق کا لامسہ ہے نابغہ

اس کی ہر نوائی، لے نئی، فضا نئی،

بے نیازِ بندشِ قاعدہ ہے نابغہ

خط دگر، روش دگر، رُخ دگر، کشش دگر،

باغیٔ مراسِم ضابطہ ہے نابغہ

خود منحرفِ عناں، خود محرکِ رکاب

خود ہی زاویہ کشِ شاہرہ ہے نابغہ

جو رسائی سے ہو دُور، اور عبور سے نفور

وہ گُلِ شگفتۂ بادیہ ہے نابغہ

نقد سنج و نغز گو، نکتہ چین و نکتہ رس

خود ہی خوب و زشت کا جائزہ ہے نابغہ

پردہ ہائے ساز میں نغمہ پوش و نغمہ پاش

گہ خموش، گہ خروش، مطربہ ہے نابغہ

سرخوشِ سرور ہے غم کے کیف سے کبھی

عین عیش میں کبھی غم زدہ ہے نابغہ

جو خود اپنے وجد سے وا کرے فشار کو

اصل اور مجاز کی وہ گرہ ہے نابغہ

باوجودِ مہر و مہ یہ فضائیں ہیں سیہ

اس گھٹا میں مشعلِ بازغہ ہے نابغہ

مُصلحِ مِلل یہی، مہدیِ سُبل یہی

اس سوادِ تیرہ کی شمعِ رہ ہے نابغہ

صد ہزار کہکشاں، اس کا ایک ارتعاش
برقِ سوز و چرخ دوز صاعقہ ہے نابغہ

اس کی جنبشِ قلم، انقلابِ ملک و قوم
تاج اور تخت کا فیصلہ ہے نابغہ

دُنیوی قیاصرہ، اس کے در کے ہیں گدا
وہ ہیں مہرے اور شہِ کجکلہ ہے نابغہ

دہر کے اکاسرہ ذرّہ ہائے گردِ رہ
لازوال و جاوداں بادشہ ہے نابغہ

اس کا اِک اشارۂ لبِ جہانِ رستخیز
بے پناہ سطوتِ قاہرہ ہے نابغہ

اس کی اور جنون کی ہیں حدیں ملی ہوئی
میسرہ جنون ہے، میمنہ ہے نابغہ

سینکڑوں عبارتیں اس کے سادہ سے نقاط
بے لُغت کلام کا حافظہ ہے نابغہ

اِس کی نوک اور پلک دُھوپ چھاؤں کی جھلک
ہیئتِ نجوم کا زائچہ ہے نابغہ!
اس کے ہر فسانہ میں عطرِ ناب کی مہک
زلفِ مشک و عنبر و غالیہ ہے نابغہ
مے کہیں، سمن کہیں، لے کہیں، شفق کہیں
مستی و شمیم کا سلسلہ ہے نابغہ
حاصلِ جہاں بشر، حاصلِ بشر ادب
اور ادب کی زینتِ حاصلہ ہے نابغہ
شبنمی لطافتیں سینچتی ہیں اِس کے خواب
پرفشانِ سایۂ مادّہ ہے نابغہ
اس میں عزق و جذب ہے ماورائے ماوراء
جوہرِ خیال کا آئینہ ہے نابغہ
یہ نہ ہو تو حُسن کی نازشوں میں ہو کمی
حُسنِ ناتمام کا تکملہ ہے نابغہ

آشکار اسی سے سب خطّ و خال و تار و پود
ساری کائنات کا نبصرہ ہے نابغہ

شہرت اس کا آستاں، جبرئیل پاسباں
معنوی جمال کی بارگہ ہے نابغہ!

ہر افق پہ ہر طرف حیرتیں جگر بکف
سحر ہے طلسم ہے شعبدہ ہے نابغہ!

کیوں نہ ہو میرا قلم لالہ زائے صد ارم
آج سرخیٔ ورق نابغہ ہے نابغہ

ارضِ لُدّ
یکم دسمبر ۱۹۳۴ء

قلمکار (۲۰ جنوری ۳۵ء)



تبریک

(بتقریب شادی خانہ آبادی آغا غضنفر علی خان صاحب)

گُل و مُل نے یہ نوشہ کو نوید فرحت افزادی
کہ آئی ہے بہارِ زندگی بن کر تری شادی
نشاطِ نوشہی وہ دِلفریب اور بے بہا شے ہے
لُٹاتی ہے جوانی جس پہ تنہائی کی آزادی
یہ سہرا کیا ہے شوق آگیں نگاہوں کی لٹیں، جن کو
لطیف و دلکش و رنگیں قبا فطرت نے پہنادی
کہیں دیکھا فشار و انتشار ایسا نگاہوں کا
بیک فرصت یہی کلیاں، یہی گلچیں، یہی وادی

نہ اپنے من میں جب پھولی سمائیں نیم وا کلیاں
تو یوں محفل کی محفل ایک انگڑائی سے مہکا دی

گھڑی آتی ہے ایسی ہر منگیتر زوج کے سن میں
کرشمہ ہوتا ہے دولہا اور دلہن پھولوں کی شہزادی

مبارک جملہ احباب و عزیزان غضنفر کو
یہ تقریب سعید کتخدائی خانہ آبادی!

ارض لد
۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء

مُرجھانے کے بعد

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
آہ کو چاہئے اِک عمر اثر ہونے تک

غالب

وعدۂ رنگیں سے ہوگا ہائے کیا خاک التیام
آرزو کے پھول چٹکی سے مَسل جانے کے بعد
یوں بر آنے کو بر آئیں بھی تمنائیں تو کیا
دَورِ خوش آئندِ برنائی کے ڈھل جانے کے بعد
اپنے ایفائے خودی کا ہوش رہتا ہے کسے
ٹھوکریں سہہ سہہ کر آہوں سے بہل جانے کے بعد
کیا کریں خونِ طرب کی سُرخیِ افسانہ کو
رنگ و بُو کی رائیگاں گھڑیوں کے ٹل جانے کے بعد

مے انڈیلی بھی جو میناؤں میں ساقی نے تو کب
شیشہ ہائے رنگ سے موسم نکل جانے کے بعد

لا اُبالی لغزش آئے گی کہاں سے لوٹ کر
توبہ شکنی کی بھی گر، دل کے سنبھل جانے کے بعد

کون افسردہ جوانی کو جِلائے گا ندیم!
عہدِ ناؤ نوش کی شمعیں پگھل جانے کے بعد

(۲ر ستمبر ۱۹۳۴ء)



مشربِ ہوَس

کہتی تھی محبّت یہ کسی سادہ جواں سے :

"باز آؤ، رہو دُور ہی چنگل سے ہوَس کے
اس ساحرہ کی دام پناہی سے بچو تُم
یہ باندھتی ہے اپنے گرفتاروں کو کس کے
دِل موہ نہ لے اِس کے خمِ زُلف کا انداز
جاذب ہیں شکنج اس کے دِل آویز قفس کے"

یہ لاگ محبت کی گراں گذری ہوَس پر
بولی مگر اِک رسمیہ جھُوٹی ہنسی ہنس کے
سُن او مری نقّاد! یہ ہے عکس ترا ہی
آتے ہیں نظر عیب جو ہمساز و نفَس کے
کیا تیرا یہ حیلہ ہے یونہی اور بھی ترسیں
کرتی ہے بسر جیسے بظاہر تو ترَس کے!

شایاں نہیں خودکامئ دُزدیدہ کی تردید
یُوں آرزوئے حُسن کی خوشبوؤں میں بس کے
لذّت تیرے بوسوں کی بھی ہے ویسی ہی ناقص
ہیں خام جو میرے دہن د کام سے کے چسکے
اِک میرے ہی مشرب میں روا وصل نہیں کچھ
پیاسے ہیں سبھی مست یہاں پریم کے رس کے
کھُل جائے بھرم تیری سکوں پوش کشش کا
پردہ کہیں جذبات کی کروٹ سے جو مسکے!
معلوم حقیقت ہے مجھے تیری وفا کی
ریشم کا ہے اِک خول چڑھا خوشۂ خس کے!
جدّت کے تصرّف ہی سے ہے شُستگیٔ ذوق
رومان ہوں کیوں تازہ نہ ہر تازہ برس کے"

(۱۶ / نومبر ۱۹۳۴ء)

معراج

(سالگرہ معراج ۱۳۵۳ھ)

اوجِ سرِ گردوں کا غرور آج ہے تاراج
اقصائے وراسے ہے وراء مرکبِ معراج!

دو سالگرہ کا ہے تپاک آج ہم آغوش
تابانیٔ دیوالی و تاب و تبِ معراج

یوں آئے تیوہار بہم ہند میں اک بار
شامل ہیں چراغاں میں نجوم اور سراج آج!

صدیاں ہوئیں بچھڑی ہوئی نگری کو اسی شام
بن باس سے لوٹے تھے شری رام مہاراج

اور خاک نے جیتی تھی اسی رات وہ بازی
تسلیم ہوئی جس سے فرشتوں کی وہ سرتاج

انسان نے اِسی رات بھری جست وہ جس سے
طے ہو گئیں صدِ منزلِ دشوارئِ منہاج[1]
رو لے گئے گردِ رہِ پہنائے سفر میں
الماس گہر، لعل، بلور، آئینہ، پکھراج
صد خوشۂ پروین کے پُلوں پر ہی سے ہوکر
گزری تھی سبک زین سواری شبِ معراج
ہے عام یہ نام شبِ معراج ، دگرنہ
شب تھی نہ سحر تھی پسِ پہنائیِ دُوّاج[2] !
رفتارِ سبک سیرئِ رُفرُف سے سبک تر
ہوتی ہیں محبت کی لطیف و سبک امواج
یوں پست دنگوں ہوتے گئے تارے جلو میں
ہر گوئے شہابی تھی سرافگندۂ اعراج[3]

[1] راستہ ، [2] بالاپوش ، [3] لنگڑاپن

ٹھہراتی ہے اِس ندرتِ پرداز کو سائنس
حدِ بستگیٔ فاصلہ و وقت سے اخراج،
سُلجھی ہے یہ پیچیدہ گرہ اس سے کہ کیونکر
"فردا" میں تجاوز پہ بھی رہ سکتی ہے "آج" "آج"!
ہاں اِلّا روشنیٔ مہر پہ سبقت سے ہے ممکن
ہر فرصتِ بے نام کا امروز میں ایلاج[1]
اے کاہکشاں روندنے والے قدموں سے!
از راہِ کرم، اُمتِ پس ماندہ کی رکھ لاج
جس طرح مدینے کی زیارت کے شرف کو
اپنے لئے معراج ہیں گردانتے حجاج،
ویسے ہی جہادِ رہِ اللہ کو سمجھیں
اسلام کے خاموش جواں یثربِ معراج!

---

[1] پہنا اور ملنا

قرنوں سے حریفوں کے ہیں ہم بستۂ فتراک
صدیوں سے ہیں ہم ترکشِ افرنگ کے آماج
پندار جنہیں تاج دنگیں کلہ ہے خود اُن پر
ہو مشرقِ افتادہ کی پسپائیوں کا راج!
اے خاصۂ خاصانِ رُسل! روحِ رسالت!!
رکھدے سرِ اُمّت پہ بصد فتح و ظفر تاج
جو خاکِ مذلت میں پڑے ہیں وہ نگوں سار
اقوامِ جہانبان و جہاندار سے لیں باج

(۲۷ رجب المرجب (۶ نومبر ۱۹۳۴ء)

ایک وہ ہیں!

ایک ہم ہیں کہ جو لکھتے ہیں قلم سے اشعار
ایک تم ہو کہ جو کرتے ہو لبوں سے اظہار
ایک وہ ہیں کہ بسر کرتے ہیں یوں شام و سحر
شعر کے رنگ میں ڈھلتا ہے خود اُن کا کردار!
اس فنازار کے بے کیف زیاں خانے میں
یہی شعریتِ وہبی ہے محال و دُشوار!

(۳۰ ر اکتوبر ۱۹۳۴ء)



No.		Page
123	"youth"	393
124	"Genius"	398
125	"Epithalamium (Ghazanfar)	405
126	"Après Affaiblissement".	407
127	"Cult of Lust"	409
128	"Climax"	411
129	"There are those" . . .	415
130	English Index" . . .	424

No.		Page
106	"Fiery Call!"	~~336~~ 322
107	"Pleasure of the Moment *(a contrast)*"	326 329
108	"Original Slip (First Mishap of Adam & Eve)"	~~324~~
109	"What a distance!"	336
110	"Rusting of Plant" — *(a strange phenomenon)*	353
111	"Secret of Gold Colour" *(from Holy Quran)*	358
112	"Petals" *(again)*	360
113	"Duck of Volga"	361
114	"Crown and Cross!"	365
115	"Proletariat Poet of Bengal"	370
116	"Glory of this Dust!"	375
117	"Pest of Donation-Hunger"	377
118	"*Saki*!" (wine-server)	382
119	"To Latifi" *by A. M.*	385
120	"Welcome!" *by M. J.*	387
121	"Nuptial Greetings" *by a group*	390
122	"Epilogue" *by A. S.*	392

:o:

No.		Page
91	"Petals"	271
92	"Quatrain"	272
93	"Petals" *(continued)*	273
94	"Capital"	277
~~95~~	~~"Slaves!" (translation)~~	~~279~~
~~96~~ 95	"What May I Say!"	278
96	"Slaves!" (translation)	279
97	"Love's Inspiration" (*Message of Islam to Comrade Jawahar Lal Nehru*)	281
98	"Offering (*Bravo! Amanullah*)"	289
99	"Palestine"	294
100	"Devotion to Divinity"	297
101	"Sorcery of Dispensation"	301
102	"Whom do you seek now?"	305
103	"*(Miss) Nila Nagani.*"	309
104	"Technique."	313
105	"Cry in the Wilderness"	316

No.		Page
75	"Epithalamium" *(Arif)*	239
76	"*Qita* (piece)	241
77	"Wail of Candle"	242
78	"The Shackled"	243
79	"Mirzai Mischief Monging"	244
80	" Upstarts (*images carved just yesterday*)"	247
81	"Jagan Nath Thapar" — *(a satire)*	249
82	"Dashing Retaliation in Card Playing" — *(a satire)*	252
83	"Bier of Congress" *(local)*	255
84	"Epitaph"	258
85	" Somebody's Doom"	259
86	"Eventide!" *(Translation)*	261
87	"Lustful Fellow Fed up"	263
88	"Last Hour Regret"	265
89	" Reminiscence of Shelley "	267
90	"Mood of Memory" (*sonnet*)	269

No.		Page
59	"Hindu *Jati*"	198
60	"Livelihood"	199
61	"Beggar Children"	203
62	"A Way-farer's Solicitation"	208
63	"What We Were!"	210
64	"Alternative"	212
65	"Warrior Chief of Seranga-patam"	214
66	"Sacreligious attack of Prof. Bruce on the last Treasure of Islam"	217
67	"Martyr"	219
68	"Good *versus* Evil!"	221
69	"Light Showering Day Break"	223
70	"A Wet Night!"	225
71	"Tears of Blood!"	227
72	"Warning!"	232
73	"Epithalamium *(Saeed)*"	233
74	"Plea against Heresy"	235

No.		Page
44	"Reliance"	142
45	"Thought-presupposed as an incarnate form"	145
46	"Mysterious Points of Possibilities.	148
47	"Violet Rays"	150
48	"Art"	152
49	"Long Live Land of Persia!"	155
50	"Paghman—a *fairy tale orchard*"	160
51	"O Fair Land of Punjab!"	165
52	"Off to England"	169
53	"Moon of Andlusia"	173
54	"To the Valley of the Nile"	182
55	"Ballad of Jehol (*China*)"	187
56	"Spirit of Sacrifice"	191
57	"To Habib Wafa-(*in exile*)"	193
58	"How Long?"	196

No.		Page
28	"To a Veiled Lady"	89
29	"Photo of "N........" "	93
30	"Cupid and his Chum !"	95
31	"Sunset at Shetlands"	100
32	"Blossoming"	104
33	"An Evening on Deck"	105
34	"Meagre Glimpe of Moon-lit Night."	107
35	"Stormy Evening at Sea"	111
36	"Diana in Winter"	114
37	"A Night of Honeymoon"	119
38	"Buxom Exhilaration"	121
39	"Autumn in Kenwood"	123
40	"My Dreamland"	128
41	"Wild Cypress"	131
42	"Helplessness"	137
43	"Heroic Determination"	140

No.		Page
11	"Shattering of Dream"	43
12	" What I see ? "	45
13	" Forget Me "	46
14	" O Come ! "	48
15	*Ghazal* (two pieces)	49
16	*Ghazal*	51
17	*Ghazal*	53
18	*Ghazal*	55
19	" Fair Sex "	59
20	" Flower among Flowers !	64
21	" Circus Girl "	66
22	" On the Bank of a Rivulet	73
23	"*Enivrement da Nuit Derniere*"	77
24	" Borrowed Metaphor"	79
25	" To a Fine Frame of Fair Sex"	82
26	"Wistful Plaintiveness"	85
27	"Dance"	86

Contents

of

Latifiat Vol. II

—:0:—

No.	Caption.	Page
1	*Dedication.*	2
2	"To Urdu" *(Prologue)*	3
3	First Edition *(Foreword)*	7
4	*"Hail Latifi" by A. S.*	9
5	*Sequence of Contents.*	11
6	"All From Me"	33
7	"Fading Sound of Ego's Broken Lyre"	34
8	"*Do not forget to* say salam"	38
9	"*Ghazal*"	40
10	"Parting!"	41



آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس عالیہ، اعزازی مجلس رفقاء، مجلس انتظامی [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے اور عہدیداران جامعہ [illegible]

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ [illegible] کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے اور اشد ضرورت پر مزید [illegible] دس کتابیں اور دو کتابیں [illegible] تحقیقاتی کاموں کے لیے اور اراکین دارالترجمہ [illegible] لے سکیں گے۔

۳۔ طلباء ایم اے، ایل ایل بی [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے اور [illegible] کے طلبہ تین کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ طلبہ پانچ کتابیں [illegible] جاری کی جا سکیں گی اگر اس غرض [illegible]

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائیگا۔

۵۔ بشرط موقع کتابیں [illegible] کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو مستعیر پر [illegible] کتب خانہ میں [illegible] ذمہ داری عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ نہ لگایا جائے۔

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط